نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جلد نمبر ۸ | کراچی ، ہفتہ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۵ء | قیمت چھ آنہ

۱۰ ستمبر سنہ ۱۹۵۵ء

قرآن نے کیا کہا؟

سابقہ اشاعت میں بتایا جاچکا ہے کہ اسلامی نظام میں افراد اس نظام سے ایک معاہدہ کرتے ہیں جس کی رو سے وہ نظام افراد معاشرہ کے لئے "جنت" کی ذمہ داری لیتا ہے۔ جہاں تک اس دنیا کی جنت کا تعلق ہے قرآن سب سے پہلے اس کا تعارف قصہ آدم کے ضمن میں کراتا ہے۔ (قصہ آدم کے صحیح مفہوم کے لئے کتاب "ابلیس و آدم" دیکھئے)۔ وہ کہتا ہے کہ "آدم اور اس کی بیوی" (مرد اور عورت دونوں) سے کہا گیا کہ تم اس جنت میں رہو اور کلا منہا رغداً حیث شئتما (۲/۳۵) اور اس میں جہاں سے جی چاہے بافراغت کھاؤ۔ یعنی اس دنیا میں جنتی معاشرہ کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر فرد معاشرہ کے لئے خوراک کا انتظام بافراط ہوتا ہے اور ہر جگہ ہوتا ہے۔ اس میں کوئی فرد کہیں بھی ہو بھوکا نہیں رہ سکتا۔

اس سے ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں افراد معاشرہ کے بافراط کھانے پینے کا انتظام نہ ہو وہ معاشرہ جنتی معاشرہ نہیں کہلا سکتا اور نہ ہی اس نظام کو اسلامی نظام کہا جاسکتا ہے۔

اس شمارے میں

☆ اسلامی نظام میں مال کی حیثیت ☆ نقد و نظر

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر
ہفتہ وار
طلوعِ اسلام
جلد ۸ | کراچی، ہفتہ ۱۰ ستمبر سنہ ۱۹۵۵ء | نمبر ۳۲

بیچارہ اسلامی نظام Page 3
پارٹیوں کا وجود Page 6
سوڈان کا ہنگامہ Page 6
مشرقِ وسطیٰ کا دفاع Page 7
مجلسِ اقبال Page 9
عورت قرآن کا Page 10
اسلامی نظام میں مال کی حیثیت Page 11
نقد و نظر Page 16
بزمِ طلوعِ اسلام Page 15

سلیم کے نام خطوط

ان خطوط میں ملت کے اس نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو مخاطب کیا گیا ھے جو مشرق و مغرب کے تصادم کے بعد ملوکیت کے وضع کردہ غلط مذھبی تصورات سے متنفر ھوتے ھوتے اسلام اور اسکے سرچشمۂ حیات قرآن ھی سے ھاتھ دھو چلا تھا۔ عقائد و نظریات جیسے خشک اور نازک مسائل پر اس عمدگی سے بحث کیگئی ھے کہ محسوس ھی نہیں ھوتا کہ ھم کسی خشک فلسفیانہ بحث کو پڑھ رھے ھیں۔ باتوں باتوں میں وہ دقیق اور معرکہ آرا مسائل حل کرکے رکھ دئے گئے ھیں جنھیں ضخیم مجلدات میں بھی حل نہیں کیا جاسکا تھا۔ یہ خطوط ملک کے گوشہ گوشہ سے خراج تحسین وصول کرچکے ھیں۔ قرآن کی روشنی اور محترم پرویز صاحب کا بصیرت افروز قلم۔ بڑا سائز ضخامت سوا چار سو صفحات۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب کاغذ سفید گرد پوش مصور مشرق جناب چغتائی کے قلم کا حسین مرقعہ۔ قیمت چھ روپے علاوہ محصولڈاک ۔

فردوس گم گشتہ

جناب پرویز کے ان مضامین کا مجموعہ جنھوں نے قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاھوں کا زاویہ بدل دیا ھے۔ مفہوم کے علاوہ اگر خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھئے تو اردو زبان کی بہت کم کتابیں اس پایہ کی دکھائی دینگی ۔

بڑا سائز۔ ضخامت قریب چار سو صفحات کتابت و طباعت دیدہ زیب کاغذ سفید جلد مضبوط۔ گرد پوش حسین۔ قیمت چھ روپے علاوہ محصولڈاک ۔

اسباب زوال امت

مسلمانوں کی ھزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ھے کہ ھمارا مرض کیا ھے اور علاج کیا۔

ضخامت ۱۵۰ صفحات قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ۔

اسلامی نظام

اسلامی مملکت کا بنیادی اصول کیا ھے اور اسلامی نظام کیسے قائم ھوسکتا ھے؟ اسکے جواب میں محترم پرویز صاحب اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنھوں نے فکر و نظر کی نئی راھیں کھولدی ھیں۔ قیمت دو روپے۔

اسلامی معاشرت

مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ' رھنے سہنے کا ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ھر اسلوب قرآنی آئینے میں ۔

ضخامت ۱۹۲ صفحات قیمت دو روپے ۔

قرآنی دستور

اس میں پاکستان کیلئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ھے اور حکومت' علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ھے ۔

ضخامت دو سو چوبیس صفحات
قیمت دو روپے آٹھ آنے ۔

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار

طلوعِ اسلام

جلد ۸	کراچی۔ ہفتہ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۵ء	نمبر ۳۲

بیچارہ اِسلامی نِظام

آہ اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

"محمد رسول اللہ (صلعم) والذین معہٗ" نے اپنے مبارک و مسعود ہاتھوں سے اس صفحۂ ارض پر اسلامی نظام قائم کیا۔ اس کے بہت جلد بعد گاڑی ایک دوسری پٹری پر چل نکلی اور یہ نظام ملوکیت میں بدل گیا۔ پاکستان کے حصول سے مسلمانوں کی تاریخ میں پہلا موقعہ تھا کہ اس سرزمین پر اسلامی نظام قائم کیا جاتا۔ ذرا اس اہمیت پر غور کیجئے کہ قرنِ اول کے بعد مسلمانوں کی ساری تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ انہیں ایک ایسی سرزمین ملی جس میں یہ اس نظام کو از سرِ نو نافذ کر سکتے تھے لہٰذا آپ اندازہ لگائیے کہ جن لوگوں کے دلوں میں اس آسمانی نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تڑپ تھی۔ ان کے لئے پاکستان کا حصول کس قدر موجبِ مسرت و شادمانی تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسے مسلمان بھی تھے جو اس وقت علانیہ کہتے تھے کہ:-

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں۔ وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔
>
> (سید ابو الاعلیٰ مودودی)

لیکن ان مستثنیات کو چھوڑ کر مسلمانوں کا جم غفیر ان حسین تمناؤں اور درخشندہ ولولوں کو دل میں لے کر پاکستان کی طرف آیا۔ چنانچہ یہاں پہنچنے کے بعد پہلا سوال یہ پیدا ہوا کہ پاکستان میں اسلامی آئین کا نفاذ ہو۔ اسلامی آئین کی تدوین کے لئے مجلس آئین ساز کا تقرر ہوا۔ لیکن اس سات آٹھ سال کے عرصے میں یہاں اسلامی آئین کے تصور کی جو درگت بنی ہے ہر چشمِ بصیرت اس پر خونابہ فشاں ہے ایک طرف ہمارے اربابِ بست و کشاد ہیں کہ جن میں سے ہر شخص موقعہ بے موقعہ اسلامی نظام اور اسلامی آئین کی رٹ لگائے چلا آرہا ہے؟ لیکن ان میں کسی نے بھی آج تک یہ نہیں بتایا کہ اس نظام کے متعلق اس کے ذہن میں تصور کیا ہے؟ ان سے بھی حیرت انگیز اور عبرتناک حالت ہمارے مذہبی رہناؤں کی ہے جو ہر محراب و مسجد سے یہ دہراتے چلے آ رہے ہیں کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر گوشے میں ہمیں پوری پوری رہنمائی دیتا ہے۔ لیکن ان میں سے بھی آج تک کسی نے واضح طور پر نہیں بتایا کہ وہ ضابطۂ حیات یا تصورِ زندگی کیا ہے جو اسلام پیش کرتا ہے۔ اور اسلامی نظام جس کا وہ اس شد و مد سے مطالبہ کر رہے ہیں کیسے کہتے ہیں؟ ان مطالبہ کرنے والوں میں سب سے پیش پیش جماعتِ اسلامی ہے لیکن انھوں نے بھی آج تک اس نظام کے متعلق جو کچھ کہا ہے۔ آپ اسے دیکھ جائیے اور پھر سوچئے کہ کیا اس سے آپ کی سمجھ میں کچھ بھی آتا ہے کہ ان کا مقصود کیا ہے۔ انھوں نے اسلامی نظام کی جگہ "کتاب و سنت" کی اصطلاح استعمال کرنی شروع کی ہے۔ "کتاب" کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ اس سے مراد قرآن کریم ہے جو ایک کتاب کی شکل میں ہر مسلمان کے گھر میں موجود ہے۔ لیکن اس اصطلاح کے دوسرے جزو (یعنی سنت) کے متعلق، عام مسلمان تو ایک طرف خود ان مذہبی پیشواؤں کے ذہن میں بھی کوئی متعین تصور نہیں، ہمارے پاس ایسا کہنے کی دلیل یہ ہے کہ ہم برسوں سے ان حضرات سے درخواست کرتے چلے آ رہے ہیں کہ وہ خدا کے لئے قوم کو یہ بتائیں کہ سنت رسول اللہ کونسی کتاب کے اندر ہے۔ تاکہ جب ہم "کتاب و سنت" کہیں تو ہمیں معلوم ہو جائے کہ اس سے مقصود ایک تو قرآن کریم ہے اور دوسرے فلاں کتاب۔ لیکن ان میں سے کوئی شخص آج تک اسے واضح نہیں کر سکا۔ ہم نے جماعتِ اسلامی اور اس کے سربرآوردہ حضرات سے طلوعِ اسلام کے ذریعہ اور ذاتی خطوط کے ذریعہ بار بار گذارش کی کہ وہ کسی ایک جگہ واضح طور پر یہ بتا دیں کہ سنتِ رسول اللہ کسے کہتے ہیں؟ اور وہ ہمیں کس کتاب میں ملیگی۔ اس کے جواب میں ان کی طرف سے ہمیں گالیاں تو ہزار سنائی دیں۔ لیکن اس سوال کا جواب کسی نے آج تک نہیں دیا۔ انھوں نے زیادہ سے زیادہ کہا تو یہ کہ سنت، رسول اللہ کے ثابت شدہ طریقے کو کہتے ہیں۔ ہم نے عرض کیا کہ یہ فرما دیجئے کہ اس طریقہ کو ثابت کس نے کیا۔ اور وہ ثابت شدہ طریقہ آج ہمیں کس کتاب میں ملیگا۔ اس کا پھر کوئی جواب نہیں ملا۔ لیکن ان کی طرف سے دشنام طرازی اور لعن طعن کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ خدا کی شان ہے کہ مسلمانوں نے یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ ان حضرات سے ایک خالص دینی اصطلاح کی وضاحت طلب کرنے والوں کا جواب گالیوں کے سوا کچھ بن نہیں پڑتا۔ اور دعویٰ یہ ہے کہ ہم مکمل اسلامی نظام مرتب کر کے دیدیں گے۔

اس وقت اس جگر خراش داستان کو پھر سے دہرانے کی وجہ یہ ہوئی کہ محترم ابو الاعلیٰ صاحب مودودی نے ترجمان القرآن کی تازہ اشاعت (بابت جولائی ۱۹۵۵ء) میں اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی دستور کیا ہے اور وہ یہاں کس طرح قائم ہوگا۔ ہم نے ان کی ان تصریحات کا بڑے غور سے مطالعہ کیا۔ ان میں بعض باتیں ایسی ہیں جو ہمارے نزدیک غور طلب اور مزید وضاحت کی متقاضی ہیں۔ انھیں ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

(۱) مودودی صاحب نے یہ کہا ہے کہ ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ وہ بنیادیں کیا ہو سکتی ہیں جن پر ایک صحیح مصالحانہ فضا میں زیادہ سے زیادہ اتفاق کے ساتھ ملک کا نظامِ زندگی تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ:-

> ان میں سب سے پہلی بنیاد یہ ہے کہ قرآن و سنت کو ملک کے آئندہ نظام کے لئے منبعِ ہدایت اور اولین ماخذ قانون تسلیم کیا جائے۔ اس کو بنیاد اتفاق ہم اس لئے قرار دیتے ہیں کہ ملک کی آبادی کا بڑا حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اور وہ اس بنیاد کے سوا کسی اور چیز پر راضی اور مطمئن نہیں ہو سکتے

سر دست ہم اس "بنیاد" سے بحث نہیں کرتے۔ ہم صرف اس دلیل کو سامنے لاتے ہیں جس کی بنا پر انھوں نے اپنی اس پیشکردہ بنیاد کو حق قرار دیا ہے۔ ہم محترم مودودی صاحب سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر یہ دلیل صحیح ہے کہ جس بات کو مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت صحیح کہے وہ بہرحال صحیح ہوتی ہے تو تحریکِ پاکستان کے دوران میں جب انھوں نے حسبِ ذیل ارشاد فرمایا تھا تو اس سے ان کا کیا مفہوم تھا انھوں نے کہا تھا کہ:-

> یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہتے ہیں اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق و باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور نہ ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے

بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس اسلامی نام ملتا چلا آیا ہے۔ اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انھوں نے حق کو حق جان کر اسے قبول کیا ہے نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو یہ اس کی خوش فہمی ہے۔

(سیاسی کشمکش حصہ سوم عنوان اقلیت و اکثریت)

پھر انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ

> یہ تعداد کی بنا پر قیام حکومت کا مطالبہ۔ یہ اکثریت و اقلیت کا نوحہ۔ یہ تحفظات اور حقوق کی چیخ پکار۔ یہ انگریزی سلطنت اور والیان ریاست کے ظل عاطفت میں قومی مفاد کی تعبیریں اور دوسری طرف آزادی وطن کا نعرہ اور پنڈت نہرو کے سُروں میں امپیریلزم کی مخالفت یہ سب ہمارے لئے بکری کی بولیاں ہیں۔ (ایضاً)

یہی نہیں بلکہ انھوں نے قرآن کی سند سے یہ فیصلہ دیا تھا کہ

> اسلام تعداد و اکثریت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ قل لا یستوی الخبیث والطیب ولو اعجبک کثرۃ الخبیث۔

(اسلام کا سیاسی نظریہ)

فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اُس وقت محترم مودودی صاحب کے نزدیک اکثریت کے متعلق اسلام کا مسلک اور قرآن کا فیصلہ یہ تھا تو آج وہ یہ کس طرح فرماتے ہیں کہ ان کی پیشکردہ بنیاد کے برحق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت اس کی تائید کرتی ہے۔ یعنی انہی مسلمانوں کی اکثریت جن کے متعلق انھوں نے فرمایا تھا کہ

> کہ ان میں سے ۹۹۹ فی ہزار حق و باطل کی تمیز سے آشنا تک نہیں۔

باقی رہا وہ مذہب اسلام جو صدیوں سے ہمارے ہاں رائج چلا آرہا ہے تو اس کے متعلق مودودی صاحب "تجدید دین" میں شرح و بسط سے لکھ چکے ہیں کہ یہ سب قبل از اسلام کی جاہلیت سے مرکب ہے اور حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد سے یہ اس ڈگری پر چلا جا رہا ہے۔ اور یہ بہت بڑا دھوکا ہے جو اسلام کے نام پر مسلمانوں کو دیا جا رہا ہے۔

> جاہلی امارت کی مسندوں اور جاہلی سیاست کی راہ نمائی پر مسلمانوں کا جلوہ افروز ہونا۔ جاہلی تعلیم کے مدرسوں میں مسلمان کا معلم ہونا۔ جاہلیت کے سجادہ پر مسلمان کا مرشد بن کر بیٹھنا۔ وہ زبردست دھوکا ہے جس کے فریب میں آنے سے کم ہی لوگ بچ سکتے ہیں۔

اب اسی اسلام کو جو جمہور میں رائج ہے۔ "کتاب و سنت" کہہ کر پیش کیا جا رہا ہے۔

(۴) محترم مودودی صاحب نے پھر یہ لکھا ہے کہ

> مسلمانوں کے اندر آزادی کا جذبہ جس چیز نے بھڑکایا اور جس چیز کی خاطر انھوں نے جان و مال اور آبرو کی ہولناک قربانیاں دیں۔ وہ صرف یہ تھا کہ انھیں غیر اسلامی نظام زندگی کے تحت جینا گوارا نہیں تھا اور وہ اسے اسلامی نظام زندگی سے بدلنا چاہتے تھے۔

اس سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اگر جنگ آزادی کا جذبۂ محرکہ یہ تھا کہ انھیں غیر اسلامی نظام زندگی کے تحت جینا گوارا نہیں تھا۔ اور وہ اسے اسلامی نظام زندگی سے بدلنا چاہتے تھے۔ تو پھر آپ مسلمانوں کی اس تحریک کی اس قدر مخالفت کیوں کرتے تھے؟ مخالفت ہی نہیں کرتے تھے۔ آپ اس کا استہزا کرتے تھے۔ اسے بکریوں کی بولیاں قرار دیتے تھے۔ اور اپنے متعلق یہ فرماتے تھے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ یا جہاں جہاں مسلمان کثیر تعداد میں ہیں۔ وہاں انکی حکومت قائم ہو جائے۔

اور دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حقیقت یہی تھی کہ اس وقت مسلمانوں کے اندر آزادی کا جذبہ اس خیال سے بھڑکا تھا کہ وہ غیر اسلامی نظام زندگی کو اسلامی نظام زندگی سے بدلنا چاہتے تھے۔ تو پھر تحریک پاکستان کے متعلق آپ کا یہ ارشاد کیا معنی رکھتا تھا کہ۔

> یہ اسکیم دراصل ان لوگوں کے دماغ کی پیداوار ہے جن کے ذہن کی ساری تربیت مغربی اثرات کے تحت ہوئی ہے۔ اور جنھوں نے تمدن و سیاست کے متعلق تمام تصورات یورپ کی تاریخ اور علوم عمران سے سیکھے ہیں۔ اور وہ اسلام کی الف بے تک سے ناواقف ہیں۔

علاوہ ازیں یہ چیز بھی بڑی تعجب انگیز ہے کہ جو مسلمان "حق و باطل کی تمیز تک سے بھی آشنا نہیں تھے" ان کے اندر یہ جذبہ بھڑک رہا تھا کہ وہ غیر اسلامی نظام زندگی کو اسلامی نظام زندگی سے بدل دیں۔ اور اس کی خاطر انھوں نے جان و مال و آبرو کی ہولناک قربانی دی۔ اگر وہ حق و باطل کی تمیز نہیں کر سکتے تھے تو انھیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ ان کا وہ نظام غیر اسلامی تھا۔ اور اسے اسلامی نظام سے بدلنا ضروری ہے۔

(۳) اس کے بعد مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ

> جن لوگوں کو اس بنیاد سے اتفاق نہیں ہے وہ چار طبقوں پر مشتمل ہیں۔ ایک وہ مسلمان ہیں جو اخلاق، تہذیب اور معاشرت میں اس حد تک مغربی رنگ اختیار کر چکے ہیں کہ اب انھیں اسلامی طرز زندگی کی طرف پلٹنے کے تصور سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ دوسرے وہ مسلمان جو مسلمان ہونے سے تو منکر نہیں مگر مغربی فکر و نظر سے اس حد تک متاثر ہو چکے ہیں کہ اب انھیں اسلام پر اعتقاد باقی نہیں رہا۔ یہ دونوں طبقے اپنے مخصوص رجحانات کے سبب سے ایک لادینی (سیکولر) نظام اختیار کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ کیونکہ وہی ان کے مزاج اور مذاق سے مناسبت رکھتا ہے۔ تیسرا طبقہ ان مسلمانوں پر مشتمل ہے جو اسلامی نظام سے تو انکار نہیں کرتے۔ مگر سنت کو چھوڑ کر صرف قرآن کو لینا چاہتے ہیں۔ اور چوتھے طبقہ میں پاکستان کی غیر مسلم اقلیتیں شامل ہیں۔

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ

> ان میں سے پہلے تین طبقے مسلمانوں کی آبادی میں مجموعی طور پر ایک فی ہزار کا تناسب بھی نہیں رکھتے۔

یعنی حصول پاکستان سے پہلے ارشاد تھا کہ مسلمانوں کا ۹۹۹ فی ہزار طبقہ حق و باطل کی کوئی تمیز نہیں رکھتا۔ صرف ایک فی ہزار اسلام کو جانتا ہے۔ اب انہی مسلمانوں کے متعلق ارشاد ہے کہ ان میں سے ایک فی ہزار طبقہ غلط قسم کا نظام چاہتا ہے اور باقی ۹۹۹ صحیح اسلام کے داعی ہیں ۔۔۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ہمیں ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں جو یہاں سیکولر نظام چاہتے ہیں۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ انھیں کس بات نے مجبور کر دیا ہے کہ وہ مذہبی نظام کے بجائے غیر مذہبی نظام کو ترجیح دیتے ہیں؟ مودودی صاحب تو لوگوں کی توجہ اس طرف آنے نہیں دیں گے۔ لیکن آپ سوچئے کہ جن لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ پاکستان میں اسلامی نظام رائج ہو گیا تو ہم دشمن کے قیدیوں میں سے مردوں کو غلام بنائیں گے۔ اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں۔ ان لونڈیوں سے بلا نکاح اور بلا حد تعداد جنسی لذت اندوزی حاصل کی جائے گی۔ اور پھر انھیں دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیا جائیگا۔ اور اگر کوئی مسلمان اس قسم کے اسلام سے متنفر ہو کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرے گا۔ تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ تو یہ لوگ اس قسم کے "اسلامی نظام" کے مقابلہ میں لادینی نظام کو ترجیح نہ دیں تو اور کیا کریں؟ ان حضرات کو کون بتائے کہ تعلیم یافتہ طبقہ کو مذہب سے جو اس قدر تنفر پیدا ہو چکا ہے تو

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

آپ ان کے سامنے خدا کا دیا ہوا اسلام پیش کیجئے۔ اور پھر دیکھئے کہ ان کی نفرت کس طرح محبت سے بدل جاتی ہے!

اب رہا وہ طبقہ جس کے متعلق مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ وہ اسلامی نظام سے تو انکار نہیں کرتا۔ مگر سنت کو چھوڑ کر صرف قرآن کو لانا چاہتا ہے تو ہمیں معلوم نہیں کہ پاکستان میں وہ کونسا طبقہ ہے جو اس مسلک کا حامی ہے۔ "اہل قرآن" کے فرقہ نے کبھی اس قسم کی بات ضرور کہی تھی۔ لیکن اب تو پاکستان میں ان کا کوئی چرچا ہی نہیں۔ لیکن اگر مودودی صاحب کا اشارہ طلوع اسلام کی طرف ہے تو ہم اس حقیقت کو ایک بار پھر دہراتے ہیں جسے ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ اگر وہ ہم پر یہ الزام نادانستہ لگاتے ہیں تو یہ بہت بڑی جہالت ہے اور اگر وہ دانستہ ایسا کرتے ہیں تو یہ بڑی افسوسناک حرکت ہے۔ ہم ایک مرتبہ پھر اس چیلنج کو دہراتے ہیں کہ وہ سنت رسول اللہ ﷺ کے بارے میں طلوع اسلام کے خلاف کوئی الزام (سند کے ساتھ) عاید کریں اور پھر دیکھیں کہ اس باب میں خود مودودی صاحب کے متعلق کیا ثابت ہوتا ہے!

لیکن ان تمام تصریحات کے بعد یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ اگر اس ملک کی ۹۹۹ فی ہزار آبادی وہ نظام چاہتی ہے جو مودودی صاحب کے تصور کے مطابق اسلامی ہے۔ تو پھر وہ یہاں صحیح اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے اس قدر شور کیوں مچاتے ہیں؟ کیا ان کا خیال ہے کہ یہ ایک فی ہزار آبادی اتنی صاحب اثر ہے کہ وہ ۹۹۹ کے علی الرغم اپنی مرضی کا نظام نافذ کردے گی۔؟

(۴) اس کے بعد مودودی صاحب بنیادی سوال کی طرف آتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ

> قرآن و سنت کو بنیاد بنانے کے خلاف ایک دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ قرآن کی تعبیروں میں بکثرت اختلافات ہیں اور کوئی ایک تعبیر متفق علیہ نہیں ہے۔ رہی سنت تو اس میں صرف تعبیرات ہی کا اختلاف نہیں بلکہ اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ کیا چیز سنت ہے اور کیا نہیں ہے۔ پھر یہ دعویٰ کیسے کیا جاتا ہے کہ یہی وہ بنیاد ہے جس پر ملک کی آبادی کا کثیر حصہ متفق ہے۔

ہم بہت خوش ہوئے تھے کہ مودودی صاحب نے بالآخر اس سوال کو لے لیا جسے ہم اتنے عرصے سے پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یعنی یہ سوال کہ کیا چیز سنت ہے اور کیا نہیں۔ لیکن اس کا جواب سنئے۔

> اس کا جواب یہ ہے کہ ہم قرآن کی کسی خاص تعبیر کو نہیں بلکہ بجائے خود قرآن کو اور سنت کے متعلق کسی خاص مسلک کو نہیں، بلکہ بجائے خود سنت رسول اللہؐ کو نظام زندگی کی بنیاد قرار دے رہے ہیں۔ اور یہ بنیاد ایک ناقابل لحاظ اقلیت کو مستثنیٰ کر کے مسلمانوں میں متفق علیہ ہے۔

آپ حیران ہوں گے کہ اس میں اس اہم سوال کا تو جواب آیا ہی نہیں کہ "کیا چیز سنت ہے اور کیا نہیں؟" لیکن ہمارا کیا قصور ہے۔ مودودی صاحب کی طرف سے پیش کردہ سوال اور ان کا جواب دونوں آپ کے سامنے ہیں۔ اگر کوئی صاحب ان سے اس سوال کا جواب لے سکتے ہیں تو وہ کوشش کر دیکھیں۔ یہ بات ہمارے بس کی تو ہے نہیں۔ ہم تو صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ اس سوال کا جواب یہ کبھی نہیں دیں گے۔ اس لئے کہ یہ اس کا جواب کچھ بھی دیں دنیا دیکھ لے گی کہ وہ جواب ۹۹۹ فی ہزار مسلمانوں کے نزدیک کبھی متفق علیہ نہیں ہوگا۔ اور اس طرح اس دعوے کا بھرم کھل جائے گا۔ کہ "کتاب و سنت" وہ بنیاد ہے جو یہاں کی آبادی کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ یہ متفق علیہ اس وقت تک ہے جب تک اسے مبہم رکھا جائے جونہی اس کی تشریح ہوئی یہ متفق علیہ نہیں رہے گی۔ آپ کو یاد ہوگا خود مودودی صاحب نے اگلے دنوں اس سوال کے صرف ایک گوشہ کو چھیڑا تھا۔ اور برکت علی محمڈن ہال کی تقریر میں اتنا کہہ دیا تھا کہ ہم بخاری شریف کی حدیثوں پر بھی تنقید کر سکتے ہیں۔ اس پر ملک کے ایک عظیم گروہ نے جو "کتاب و سنت" کو آئین کی بنیاد قرار دینے میں مودودی صاحب کا حامی تھا انھیں منکرِ حدیث اور مخالفِ سنت قرار دیدیا ہے۔ اب مودودی صاحب اپنی بکھری ہوئی پوزیشن کو پھر سے سنبھالنے میں مصروف ہیں۔ لہٰذا وہ ایسی فاش غلطی دوبارہ کس طرح کر سکتے ہیں کہ سنت کے مفہوم کو واضح کر دیں۔

(۵) اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ

> یہ اختلافات تو دو طریقوں سے بآسانی حل ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ مسلمانوں میں جو گروہ معتدبہ تعداد میں پائے جاتے ہیں (مثلاً حنفی۔ اہل حدیث شیعہ) ان سے تعلق رکھنے والے معاملات پر قرآن کی اسی تعبیر اور سنت کی اسی تشریح کا اطلاق ہو جو ان کے نزدیک مسلم ہو۔ دوم یہ کہ جو معاملات تمام ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان پر وہ تعبیر و تشریح عملاً تسلیم کی جائے۔ جس پر اکثریت متفق ہو اور اقلیت کے لئے یہ حق باقی رہے کہ وہ جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر کے حق میں کثرت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

لیجئے کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مثال آپ کے سامنے آ گئی آٹھ برس سے مسلسل اسلامی نظام اور کتاب و سنت کا شور سنتے چلے آ رہے تھے۔ اب اس کی متعین صورت سامنے آئی تو اسلامی نظام کا مطلب یہ ہوا کہ

> (۱) جہاں تک پرسنل لا کا تعلق ہے۔ یہاں کے مختلف فرقوں کو اجازت دیدی جائے کہ وہ اپنے معاملات اپنی اپنی فقہ کے مطابق طے کر لیا کریں
>
> اور
>
> (۲) جہاں تک عام ملکی معاملات کا تعلق ہے ان کا فیصلہ فقہ حنفی کے مطابق کیا جائے۔ (اس لئے کہ یہاں کی اکثریت فقہ حنفی کی پابند ہے)

جہاں تک پہلی شق کا تعلق ہے یہ انگریز کی حکومت کے دوران میں بھی رائج تھی۔ لہٰذا پاکستان کے آزاد آئین سے مطلب یہ ہوا کہ ملک کے عام معاملات کو فقہ حنفی کے مطابق طے کیا جائے۔

اگر اسی کا نام اسلامی نظام تھا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے لئے کتاب و سنت، کتاب و سنت کی رٹ لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ سیدھی طرح پہلے ہی دن یہ کیوں نہ کہدیا کہ ملک میں فقہ حنفی کے مطابق قوانین رائج کئے جائیں۔ اس سے ہر ایک کے ذہن میں بات صاف طور پر آ جاتی۔ پھر جو اس کی تائید کرتے وہ بھی سمجھ بوجھ کر کچھ کہتے اور جو مخالفت کرتے انھیں بھی معلوم ہوتا کہ ہم کس بات کی مخالفت کر رہے ہیں۔ شک و شبہ میں کوئی نہ رہتا۔ لیکن اس صورت میں ہمارے ان پیشوایانِ مذہب کو یہ دھوکا دینے کی گنجائش نہ رہتی کہ مخالفت کرنے والے سنت رسول اللہؐ کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اور منکرِ حدیث ہیں۔ اس لئے کہ فقہ حنفی کی سب سے زیادہ مخالفت اس فرقے کی طرف سے ہوتی ہے جنھیں اہل حدیث کہا جاتا ہے اور جو سب سے زیادہ سنت رسول اللہؐ کی اتباع کا داعی ہے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے۔ ہم نہ حنفی ہیں نہ اہل حدیث۔ ہم صرف مسلمان ہیں۔ سیدھے سادے مسلمان۔ لیکن جو کچھ مودودی صاحب نے فرمایا ہے جب اس کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو اس کے خلاف دو ایک اعتراض سامنے آتے ہیں۔ مثلاً

(۱) کیا قرآن (بلکہ قرآن و سنت دونوں) کی رو سے اسلام میں مذہبی فرقے جائز قرار پا سکتے ہیں؟ کیا قرآن نے بہ نصِ صریح فرقہ بندی کو شرک قرار نہیں دیا۔ اور کیا سنت رسول اللہؐ نے کہیں بھی حنفی۔ اہل حدیث۔ اور شیعہ وغیرہ کو اسلام کے فرقے تسلیم کیا ہے۔؟

(۲) کیا دین نے اپنے آپ کو ایسے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے کہ ایک حصے کا تعلق ملک میں بسنے والے مسلمانوں کے مخصوص فرقوں سے ہو۔ اور دوسرے کا تعلق ان تمام مسلمانوں کے مشترک معاملات سے ہو۔؟ کیا اس قسم کی تفریق اور تقسیم کی کوئی سند خدا کی کتاب (بلکہ سنت رسول اللہؐ) سے مل سکتی ہے؟ جہاں تک فقہ حنفی کا تعلق ہے ہم اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ وہ کس حد تک سنت اور کتاب کے مطابق ہے۔ لیکن اس کے متعلق خود مودودی صاحب کے چند ایک ارشادات قابلِ ملاحظہ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

> امام ابو حنیفہؒ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھیں گے جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں یا جن میں ایک قوی الاسناد احادیث کو چھوڑ کر ضعیف الاسناد احادیث کو قبول کر لیا گیا ہے۔ یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں۔
>
> (رسائل و مسائل صفحہ ۲۷۴)

پھر ارشاد ہے۔

> اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہد گزشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے۔
>
> (سیاسی کشمکش حصہ سوم)

جہاں تک فقہی قوانین کے عملی اطلاق کا تعلق ہے مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ:

> فقہا کے قوانین نہایت سخت ہیں۔ اپنی سختی کی وجہ سے عورتوں کی زندگیوں کو تباہ کرنے والے ان کو بداخلاقیوں کا پتلا بنانے والے اور ان کو مرتد بنانے والے ہیں۔ اس لئے وہ خدائی قوانین نہیں ہو سکتے۔
>
> (تنقید حقوق زوجین بحوالہ صدق ۴ مئی ۱۹۴۳ء)

یعنی خود مودودی صاحب کی تحقیق کے مطابق فقہ حنفی خدا کا قانون نہیں ہے۔ اس میں کئی باتیں احادیث کے بھی خلاف ہیں اور قرآن کے بھی خلاف۔ مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ ان کی اس تجویز سے ملک کے اختلافات دور ہو جائیں گے لیکن ذرا سنئے کہ وہ اس باب میں اس سے پہلے کیا ارشاد فرما چکے ہیں۔ وہ رسائل و مسائل کے صفحہ ۲۸۲ پر لکھتے ہیں۔

> مجھے افسوس ہے کہ فقہیات کو اصل دین سمجھنے کی جس ذہنیت کے باعث مسلمان مدتوں آپس میں جھگڑا کرتے رہے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے

ان کا متفق ہونا۔ اور اصل دین کے لئے مل کر کام کرنا غیر ممکن ہو گیا ہے۔ وہ ذہنیت برابر بڑے کار آتی چلی جارہی ہے۔

یہ ہے وہ نقشہ جسے مودودی صاحب اسلامی نظام اور کتاب وسنت کے مطابق آئین قرار دے رہے ہیں۔ یہ اس لئے کہ اس سے ملک کی کثیر آبادی ان کے ساتھ رہتی ہے۔ اور اس کی رو سے زمینداریاں۔ جاگیرداریاں۔ کارخانہ داریاں۔ سرمایہ داریاں۔ دولت کے ذخیرے بے حد نہایت املاک۔ اور جائدادیں سب جائز اور عین مطابق شریعت قرار پا جاتے ہیں۔ اسلامی نظام زندہ باد۔

اسی سے آپنے اس کا بھی اندازہ لگا لیا ہوگا کہ یہ حضرات قرآن کو اسلامی دستور کی بنیاد بنانے کے لئے کیوں تیار نہیں اس لئے کہ قرآن کی رو سے سرمایہ داری اور پیشوائیت دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

ہم اس حقیقت کو ایک بار پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ دنیا میں جب اور جہاں بھی اسلامی دستور نافذ ہوا اس کی صورت یہ ہوگی کہ دستور کی بنیاد قرآن اور صرف قرآن ہوگی اسلئے کہ قرآن کے حرفاً حرفاً من جانب اللہ ہونے پر تمام مسلمانوں کا ایمان ہے اور وہی دین کی یقینی بنیاد ہے۔ اس کے بعد احادیث ہوں یا فقہ وہ دین کی ایسی تعبیرات ہیں جو مختلف ادوار میں کی گئیں۔ ان سے بطور نظائر فائدہ اٹھایا جائیگا یعنی اگر قرآن کے کسی اصول کی جزئیات متعین کرتی ہوں۔ اور احادیث یا فقہ میں کوئی نظیر ایسی ملے جو ہمارے زمانے کے تقاضوں کو ٹھیک ٹھیک پورا کرتی ہے۔ تو اسے علیٰ حالہٖ اختیار کر لیا جائے گا اور اگر کوئی ایسی نظیر نہ ہو تو جو نظیر ملے اس میں مناسب رد و بدل کر لیا جائے گا۔ اور اگر سرے سے کوئی نظیر ہی نہ ملے تو ملت کا قرآنی نظام ان جزئیات کو خود وضع کرے گا۔ یہی مسلک سنت رسول اللہ کے مطابق ہوگا۔ کیونکہ رسول اللہ نے بھی قرآنی اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئیات متعین فرمائی تھیں۔ اور یہی منشائے خداوندی کے مطابق بھی ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جن امور کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ اس سے مقصود یہی تھا کہ یہ جزئیات زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلنے والی ہیں اس لئے ہر دور کا اسلامی نظام انھیں اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق خود متعین کرتا رہے گا۔ وذٰلک دین القیم۔

پارٹیوں کا وجود

مسٹر سہروردی نے ۲۶ر اگست کو ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے منجملہ دیگر امور کے مسلم لیگ کے بارے میں کہا۔

> بہ حیثیت جماعت کے مسلم لیگ باقی نہیں رہی اس کا ملک میں کوئی اثر نہیں۔ البتہ کچھ بڑے لوگ ایسے ہیں جو اپنے آپ کو مسلم لیگی کہلاتے ہیں اور وہ حکومت سے وابستہ ہیں۔ ملک میں ان کا کوئی متبع نہیں۔ اور ان کی انتہائی کوشش یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو برسر اقتدار رکھے ہیں۔

مسلم لیگ کی حالت کا یہ بڑا صحیح نقشہ ہے۔ آج مسلم لیگ کے مردہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ جیسا کہ طلوع اسلام میں اکثر لکھا گیا ہے۔ اگر برسر اقتدار طبقہ اپنے آپ کو مسلم لیگی کہلانا چھوڑ دے تو اس جماعت کی مردنی کا یہ عالم ہے کہ اس کا نام بھی صفحہ ہستی سے محو ہو جائے۔ یہ حالت اس پر اتنے طویل عرصے سے طاری ہے کہ آج اس کی جماعتی موت کے متعلق کسی شہادت کی ضرورت نہیں رہتی۔ لہٰذا ہم مسٹر سہروردی کی رائے سے پوری طرح متفق ہیں۔

لیکن دیکھا جائے تو سہروردی صاحب نے یہ مسلم لیگ کی موت کی خبر نہیں دی۔ بلکہ "باین بہانہ مگر عمر خود دراز کنم" کے مصداق رمز و کنایہ سے سامعین کو یہ جتانا چاہا ہے کہ "آؤ لوگو کہ یہیں نور خدا پاؤ گے"۔ مسلم لیگ مردہ ہے اور ان کی جماعت زندہ ہی نہیں زندہ تر بھی ہے۔ موجودہ سیاسی ماحول میں مسٹر سہروردی کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ان کی عوامی لیگ منظم اور زندہ جماعت ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مسٹر سہروردی کا یہ دعویٰ اتنا ہی خلاف حقیقت ہے جتنا یہ کہنا کہ مسلم لیگ ایک منظم اور زندہ جماعت ہے۔ عوامی لیگ کی پوزیشن کیا ہے؟ اس کی جماعتی حیثیت یہ ہے کہ مسٹر سہروردی آج تک اس کے کنوینر ہیں۔ گویا عوامی لیگ ان معنوں میں معرض وجود ہی میں نہیں آئی کہ اس کے عہدیدار منتخب کئے جائیں۔ مشرقی پاکستان میں اس کا وجود ضرور ہے۔ لیکن اس کی حیثیت سلبی ہے۔ عوامی لیگ ابھی تک صوبے کے سامنے کوئی مثبت پروگرام پیش نہیں کر سکی بہر حال اس کی زندگی چند افراد کی زندگی ہے اور یہیں جیسے مسلم لیگ کا وجود بعض ارباب حکومت کے مسلم لیگی کہلانے پر منحصر ہے۔ اسی طرح عوامی لیگ کا وجود چند افراد کے اپنے آپ کو عوامی لیگی کہنے کی وجہ سے ہے۔ مغربی پاکستان میں عوامی لیگ کا وجود ہی نہیں۔ جماعتی حیثیت سے اس کا نشان نہ کراچی میں ملے گا، نہ سندھ میں، نہ پنجاب میں، نہ سرحد میں۔

تو کیا یہ کہا نہیں جا سکتا کہ ملک میں صحیح معنوں میں کسی سیاسی پارٹی کا وجود نہیں؟ اگر یہ حقیقت ہے تو کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ سیاسی پارٹیوں کا تجربہ ناکام ہو چکا ہے۔ طلوع اسلام صراحت اور وضاحت سے لکھ چکا ہے (اور بار بار دہرا چکا ہے کہ ملت فی ذاتہٖ ایک پارٹی ہے۔ اور اسے پارٹی بازی کی لعنت میں مبتلا کرنا قرآن کی رو سے شرک کا مرتکب ہونا ہے۔ لیکن ہمارے ارباب سیاست کی یہ حالت ہے کہ وہ لاشے اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں۔ اور دوسروں کے لاشوں کو تو لاشہ کہتے ہیں لیکن اپنے کندھے پر لادے ہوئے لاشے کو زندہ سمجھتے ہیں۔ اگر حقائق کو بے نقاب دیکھا جائے تو یہ تسلیم کر لینے میں کوئی باک نہ ہوگا کہ سیاسی پارٹیاں ختم ہو چکی ہیں۔ اور چونکہ وہ تشتت وافتراق کا ذریعہ ہیں۔ اس لئے انھیں زمین کے نیچے، بہت نیچے دفن کر دینا چاہیئے۔ ان لاشوں کے تعفن سے معاشرہ کی فضا بہت زیادہ کثیف اور زہر آلود ہو چکی ہے۔ لہٰذا اب انکی تجہیز و تکفین میں قطعاً تاخیر نہیں کرنی چاہیئے۔

سوڈان کا ہنگامہ

یہ عجیب سوءِ اتفاق ہے کہ قومی جد و جہد کے ایک فیصلہ کن دور میں داخل ہوتے ہی سوڈان ایسے ہنگامے کا شکار ہو گیا ہے جس کا خاطر خواہ حل نہ ہوا تو اس کا سفر بڑا پر صعوبت ہو جائے گا۔ سنہ ۱۹۵۳ء کے معاہدے کے مطابق برطانیہ اور مصر نے اس پر اتفاق کیا تھا کہ ایک بین الاقوامی کمیشن کی نگرانی میں نظم و نسق حکومت کو سوڈانی بنایا جائے۔ اور اس عمل کے پورا ہونے پر دونوں ممالک کی فوجوں کو واپس بلا لیا جائے۔ اس کے بعد سوڈان کو ایک مجلس دستور ساز منتخب کر کے اس کے ذریعے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ آزاد ہونا چاہتا ہے یا مصر سے الحاق کا متمنی ہے۔ اس معاہدے کی رو سے جو انتخابات منعقد ہوئے اس میں نیشنل یونینسٹ پارٹی برسر اقتدار آئی اور اس کے قائد اسمٰعیل الازہری وزیر اعظم بنے۔ یہ پارٹی مصر سے الحاق کے حق میں تھی، اور اس نے آزادی کی داعی امہ پارٹی کو شکست دیدی تھی۔ اس فتح کا خیر مقدم مصری حلقوں میں قابل فہم تھا۔ دنیائے اسلام میں بھی اسے خوش آئند سمجھا گیا کیونکہ ایک تو اس سے اس پارٹی کو شکست ہوئی تھی جو برطانیہ کے زیر اثر تھی۔ دوسرے اس سے وادی نیل کی وحدت بالکلیہ یقینی ہو جاتی تھی۔ جو سوڈان اور مصر دونوں کے لئے مفید تھی

واقعات کی اس رفتار سے عمومی اطمینان پیدا ہو گیا تھا مگر بہت جلد یہ اطمینان نیل کی راہ میں بہہ کر بحر روم کی موجوں کی نذر ہو گیا۔ سوڈان کا معاہدہ مصری سیاست کی غیر معمولی کامیابی تھی۔ کیونکہ برطانیہ کی استعمارانہ ضد نے اس نزاع کو لاینحل سا بنا دیا تھا۔ اتفاق کی بات یہ کہ مصر سوڈان کے تصفیہ کو خاطر خواہ طریق سے حل کر لینے کے بعد ایسے اندرونی خلفشار سے دوچار ہوا کہ بیرون ملک اس کا وقار خاک میں مل گیا۔ اس کا سوڈان پر کافی اثر ہوا۔ اور اس کے قائدین کے دلوں میں الحاق مصر کے خلاف جذبات پیدا ہونے شروع ہو گئے چنانچہ اسمٰعیل الازہری جو مصر کے آدمی سمجھے جاتے تھے اور جن کی پارٹی کی کامیابی پر برطانیہ نے مصر پر الزام لگایا تھا کہ اس نے ناجائز ذرائع سے کام لے کر اسے کامیاب کرایا ہے۔ وہ آزادی کی باتیں کرنے لگے۔

اب اگست میں نظم و نسق کے سوڈانی بنائے جانے کا عمل پورا ہوا تو سوڈان کی پارلیمان نے مجلس دستور ساز کے معرض وجود میں لانے کی قرارداد منظور کی۔ اس قرارداد کے منظور ہوتے ہی جنوبی علاقوں میں فوج نے بغاوت کر دی۔ یوں تو فوجی بغاوت کسی ملک کے لئے کسی وقت بھی قابل قبول نہیں ہوتی لیکن اس بغاوت کا وقت خصوصیت سے تشویشناک تھا اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ مجلس

دستور ساز کے انتخاب میں رخنے پیدا کئے جائیں اور مستقبل سے متعلق فیصلے کو ملتوی کردیا جائے۔ جنوبی علاقے سوڈان کے لئے ایک عرصے سے تکلیف دہ ثابت ہوتے چلے آرہے ہیں۔ ان صوبوں میں غیر مسلم اقلیت آباد ہو جو مقابلتاً زیادہ پسماندہ ہے۔ انگریزوں نے ان پر یوں توجہ صرف کی کہ انھیں شمالی مسلمان سوڈان کے خلاف خوب اکساتے رہے شمال اور جنوب کی مصنوعی تفریق پیدا کرکے اسے حقیقی سا بنا کر انگریزوں نے سوڈان کے مطالبہ آزادی کو یہ کہہ کر ٹھکرانا شروع کردیا کہ ملک آزادی کے قابل نہیں کیونکہ جنوبی سوڈان کو خطرہ ہے کہ شمالی سوڈان اس پر چھا جائیگا اور اس خطرے سے بچنے کے لئے وہ انگریزوں کو ملک میں باقی رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے باوجود انگریزوں کو بالآخر سوڈان چھوڑنے پر مجبور کردیا گیا۔

وزیر اعظم الازہری کے بیان کے مطابق جنوبی سوڈانی فوج کی ایک کمپنی کو شمال کی طرف منتقل کیا جارہا تھا کہ اس نے جانے سے انکار کردیا۔ اور افسروں پر حملے کئے۔ باغیوں کا مطالبہ ہے کہ انھیں شمالی علاقے کی فوجوں کو جنوب سے واپس بلا لیا جائے۔ نیز وہ برطانی اور مصری فوجوں کے آگے ہتھیار ڈالیں گے۔ سوڈانی وزیر اعظم نے بجا طور پر دونوں مطالبات کو مسترد کردیا ہے۔ کیونکہ دونوں ناقابل قبول ہیں۔ دوسرا مطالبہ معنی خیز ہے۔ ۱۲ اگست کی قرارداد کے مطابق برطانوی فوجیں سوڈانی معاملات میں مداخلت نہیں کرسکتیں الا یہ کہ حکومت سوڈان خود ایسی خواہش کا اظہار کرے۔ گویا باغی کسی نہ کسی بہانے سے غیر ملکی فوجوں کو واپس بلانا چاہتے ہیں۔

بعض اطلاعات سے مترشح ہوتا ہے کہ الحاق کے خلاف فضا دیکھ کر مصر کوشش کررہا ہے کہ کسی طرح وہ سوڈان کے معاملات میں دخیل رہے تاکہ مجلس دستور ساز سے الحاق کا فیصلہ کرا سکے اس لئے وہ جنوب میں بدامنی پیدا کرکے اپنی فوجوں کی واپسی کا جواز پیدا کررہا ہے۔ کہا نہیں جاسکتا کہ یہ کہاں تک درست ہے؟ سوڈانی وزیر اعظم نے بغاوت کے اسباب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ فی الوقت وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن قاہرہ ریڈیو نے نقصان ضرور پہنچایا ہے۔ خصوصیت سے اس کے ان نشریات نے جو جنوبی سوڈان کی زبان میں تھے۔ خود مصر نے بھی شبہ پیدا کرنے کی کافی گنجائش پیدا کردی۔ جونہی بغاوت کی خبر آئی۔ مصری حکومت نے برطانیہ کو یہ تجویز پیش کی کہ وہ دونوں اپنی فوجیں سوڈان میں استعمال کریں۔ برطانیہ نے اس تجویز کو مسترد کردیا کیونکہ بغیر سوڈان کی درخواست کے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا لیکن وثوق سے واقعی یہ کہنا مشکل ہے کہ بغاوت میں مصر کا ہاتھ ہے۔ اس میں برطانیہ کا بھی ہاتھ ہوسکتا ہے۔ ایک تو برطانیہ یہ نہیں چاہتا کہ سوڈان مصر کے ساتھ ملے۔ دوسرے جنوبی سوڈان برطانوی علاقہ یوگنڈا سے ملتا ہے اور ایسی خبریں آئی ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ باغیوں کے لئے یوگنڈا کے دروازے کھلے تھے۔ حقیقت حال کچھ بھی ہو۔ اس سلسلہ میں برطانیہ کو بالکل بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اس بغاوت کے حقیقی اسباب کیا ہیں۔ اس کا جواب تو پوری تحقیق حال کے بعد ہی مل سکے گا۔ اتنا یقینی ہے کہ اس سے سوڈان کے مستقبل سے متعلق فیصلے کے متاخر ہوجانے کا احتمال ضرور پیدا ہوجاتا ہے۔ نیز اس سے سوڈان میں مصر کے خلاف جذبات کے اور شدید ہوجانے کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔ نہ یہ سوڈان کے حق میں مفید ہے نہ مصر کے حق میں۔ اس وقت مقدم یہ ہے کہ سوڈان اجنبی تسلط سے آزاد ہو۔ مصر سے الحاق ایک ضمنی مسئلہ ہے۔ سوڈان سے برطانوی اثر کے خاتمہ پر اس کی اہمیت وہ نہیں رہے گی جو مصر سمجھتا ہے۔ مصر جن فوائد کے لئے وادی نیل کی وحدت پر مصر ہے۔ وہ مصر اور سوڈان کے ایک ملک نہ ہونے کے باوجود حاصل ہوسکتے ہیں۔ لیکن ان فوائد کے حصول کے لئے مصر کو اپنا رویہ بدلنا پڑے گا۔ سوڈان کا جذبہ از خود پیدا ہوا یا انگریز کا پیدا کردہ ہے یہ علیحدہ بحث ہے۔ لیکن اب اس جذبہ کو کچلنا نفسیات قومی کے تقاضے کے خلاف ہوگا۔ مصر کو چاہیئے کہ وہ سوڈان میں اپنی ساکھ پیدا کرے۔ اور اہل سوڈان کے دل میں اپنا اعتماد بٹھائے۔ تاکہ سوڈان آزاد ہوکر اس سے پورا پورا التعاون کرے۔ اس التعاون میں وحدت کے سب فوائد مضمر ہیں۔ اس تعاون کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ دو ممالک اسلامیہ کا ایک دوسرے سے کشیدہ رہنا ان دونوں کے مفاد میں ہے نہ دنیائے اسلام کے حق میں۔ ہماری شامت اعمال دیکھیے کہ مغرب کے ممالک کا رزمین را نکوساخت۔ اجرام فلکی کو مسخر کرنے کی فکر میں ہیں۔ اور ہم سے اپنا اپنا گھر بھی سنبھالا نہیں جاسکتا!

مشرق وسطیٰ کا دفاع

مشرق وسطیٰ بالخصوص عالم عرب کا موجودہ ہیجان اور اضطراب ہر چند بیرونی عناصر کا شرمندہ تخلیق نظر آتا ہے لیکن بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس کا سبب اصلی متعلقہ ممالک کا باہمی تشتت وافتراق ہے۔ عدم وحدت نے ان ممالک کی مجموعی قوت کو ایسا بے اثر کردیا ہے کہ اب وہ کمزور و پسماندہ ہوکر دوسروں کے رحم وکرم کے محتاج ہوگئے ہیں۔ یہ ممالک کس حد تک ایک دوسرے سے متفرق تھے۔ اس کا بدترین مظاہرہ ۱۹۴۸ء میں ہوا جب یہ بظاہر ایک ہی مقصد کے تحت اور ایک ہی جذبہ سے سرشار ہوکر فلسطین کی نوزائیدہ یہودی حکومت کے خلاف صف آرا ہوئے۔ عرب اتحاد کے مقابلہ میں حقیر سی نئی غاصب سلطنت کی کچھ حیثیت نہ تھی۔ لیکن اتحادی عرب مشترکہ دشمن کے خلاف لڑنے کی بجائے اپنے حلیفوں کے مقابلہ میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے میں لگ گئے۔ اس کا نتیجہ یہی ہوسکتا تھا کہ ان کو منہ کی کھانا پڑی۔ چنانچہ وہ سب شکست کھا گئے اور یہودی اس علاقہ سے کہیں زیادہ علاقہ ہتھیانے میں کامیاب ہوگئے۔ جو انھیں اقوام متحدہ نے تفویض کیا تھا۔ اس وقت سے کر آج تک عرب اپنے کئے کی سزا بھگت رہے ہیں۔

جنگ فلسطین کی شکست میں عربوں کے لئے بڑی عبرت تھی۔ اس جنگ نے بلاشائبہ تردید یہ ثابت کردیا تھا کہ عرب غیر متحدہ کر نہ بیرونی سلطنتوں کے حریف ہوسکتے ہیں۔ اور نہ آبرومندانہ زندگی گزار سکتے ہیں۔ لیکن انھوں نے اس سے کوئی سبق حاصل نہ کیا۔ اور ان کے دل بدستور ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں۔ یہودی اس نفاق کا فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ اور کبھی اس سرحد پر اور کبھی اس سرحد پر حملے کرکے اکا دکا عرب ملک کو مصروف پیکار رکھتے ہیں۔ انھوں نے اب تک عربوں کو چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ ان کی کوشش یہ نظر آتی ہے کہ آئے دن ہنگامے برپا کرتے رہیں۔ تاکہ تنگ آکر عرب ان سے مفاہمت کرلیں۔ اور ان کی حکومت تسلیم کرلیں۔ یہودی یہ نتیجہ پیدا کرسکیں گے یا نہیں مگر انھوں نے ہنگامی طور پر اپنے علاقہ میں تھوڑی بہت اور توسیع کرلی ہے۔ عربوں نے اس دوران میں یہودیوں سے براہ راست مذاکرات نہیں کئے۔ اور نہ انھیں تسلیم کیا۔ البتہ اقوام متحدہ کے نمائندوں کی وساطت سے وقتاً فوقتاً گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ اور ایسے فیصلے ہوتے رہتے ہیں کہ جن کا فریقین کو پابند سمجھا جاتا ہے۔ ان کا مطالبہ یہ رہا ہے کہ یہودی ان دس لاکھ عرب مہاجرین کو واپس لے لیں۔ جو جنگ سے پیشتر ان کے علاقے میں آباد تھے۔ نیز وہ اپنی حدود کو اقوام متحدہ کی قرارداد کے مطابق کرلیں اور زائد علاقے عربوں کو دیدیں۔ یہ مطالبات نہ یہودیوں نے تسلیم کئے اور نہ عرب تسلیم کراسکے جنگ کے بعد دوسری ناکامی تھی جس کا منہ عربوں کو دیکھنا پڑا۔ اس کی وجہ بھی وہی تھی جو جنگ میں ان کی شکست کا باعث بنی تھی یعنی باہمی تشتت وافتراق۔ لیکن عربوں نے نہ پہلی ناکامی سے سبق سیکھا۔ اور نہ دوسری ناکامی سے۔

ان حالات نے مشرق وسطیٰ میں ایک مستقل کشیدگی کی صورت پیدا کردی ہے۔ کیونکہ یہ علاقے عالمی سیاست میں بڑی اہمیت کے مالک ہیں۔ اس لئے کشیدگی بین الاقوامی توجہ کا مرکز بن گئی ہے۔ روس اس صورت حال کو دیکھ کر گئی طریقوں سے اپنے آدمی بھیج کر اپنے حق میں فضا ساز گار کررہا ہے۔ وہ وطنی اقتضاءات پر زور دے کر جذبات ونظریات کو اقوام مغرب کے خلاف ابھار رہا ہے۔ یہ اس کے لئے نہایت آسان کام ہے۔ کیونکہ اقوام مغرب کی غلامی میں رہنے کی بدولت ان علاقوں میں مغرب کے خلاف جذبات پائے جاتے ہیں۔ اس پروپیگنڈے میں ہندوستان روس کا ہاتھ بٹا رہا ہے۔ روس فکری انتشار پیدا کرکے رائے عامہ کو اپنے حریفوں کے خلاف لہٰذا اپنے حق میں کرنا چاہتا ہے۔ اور ہندوستان کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان بحیثیت مسلمان باہمی طور پر متحد نہ ہوں۔ بلکہ اپنے آپ کو ایشیائی کہلا کر اس کی قیادت تسلیم کرلیں۔ یہ ملی بھگت "غیر جانبداری" کا تصور پیدا کررہی ہے کہنے کو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرق ومغرب کی کشمکش میں کسی ایک فریق کا بھی ساتھ نہ دیا جائے۔ لیکن عملاً اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ممالک اقوام مغرب سے کٹ جائیں۔ اور جو فوائد اقوام مغرب سے انھیں حاصل ہیں۔ وہ ان سے محروم ہوجائیں۔ تاکہ وہ بالکل ان کے رحم وکرم پر ہوجائیں۔ ہندوستان کی اپنی یہ حالت ہے کہ وہ اقوام مغرب بالخصوص امریکہ سے بھاری مقدار میں معاشی امداد لے رہا ہے۔ لیکن عربوں میں وہ غیر جانبداری کا تخم خبیث بو رہا ہے۔ تاکہ وہ کمزور رہیں۔ عرب کیا تمام مسلمان ممالک کی حالت یہ ہے کہ وہ معاشی طور پر پسماندہ ہیں۔ اور عسکری طور پر کمزور۔ یہ دوگونہ کمزوری

امریکہ کی معاشی اور عسکری امداد سے ہی دور ہو سکتی ہے۔ کیونکہ مسلمان ممالک مل کر اتنے سرمایے اور ذرائع کے مالک نہیں ہو سکتے کہ وہ اس کا مداوا کر لیں۔ نیز عالمی سیاست میں جو تند و تیز آندھیاں چل رہی ہیں۔ ان میں کمزور ممالک کا برقرار رہنا از قبیل محالات ہے۔ مشرق وسطیٰ یا ایشیا کا کوئی ملک اگر یہ سمجھتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں غیر جانبدار رہ سکتا ہے تو وہ بڑے خطرناک دھوکے میں مبتلا ہے۔ ہندوستان جیسا غیر جانبدار بھی صحیح معنوں میں غیر جانبدار نہیں۔ مسلمانوں کی حیثیت تو خاص ہے۔ محل وقوع کے اعتبار سے وہ اتنی اہمیت کے مالک ہیں کہ ان کا غیر جانبدار رہنا از قبیل محالات ہے۔ نیز موجودہ معاشی اور عسکری بدحالی کی زندگی گذارتے چلے جانا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ لہٰذا وہ مجبور ہیں کہ کسی بڑی قوم روس یا امریکہ کا ساتھ دیں۔

یہ ظاہر ہے کہ جب بڑی قوم سے بھی رشتہ جوڑا جائے اس سے اس قوم کو جو فائدہ ہو سو ہو کم از کم ہمیں یہ فائدہ ضرور حاصل ہونا چاہیئے کہ ہماری دوگونہ کمزوری رفع ہونے کے امکانات روشن ہو جائیں۔ اس کے لئے دیکھنا ہوگا کہ یہ فائدہ کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے؟ اس نقطہ نظر سے انتخاب کرتے وقت ہمیں جذبات کو ایک طرف کر کے حقائق کو بچشم العین دیکھنا ہوگا۔ پہلے روس کو لیجئے۔ روس آج تک کسی غیر قوم کو مدد نہیں دے سکا۔ اس نے جو مثال قائم کی ہے وہ یورپ کے حلقہ بگوش ممالک میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ ممالک کلیتہً اس کے تصرف میں ہیں۔ اور وہاں کمیونزم کا نظام رائج ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ روس انھیں کس قدر مدد دے رہا ہے لیکن یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ وہ واقعی ایسا کر رہا ہے تو بھی یہ سودا بڑا مہنگا نظر آتا ہے۔ کوئی ملک بخوشی دوسرے کا غلام نہیں ہو سکتا۔ مسلمان ممالک کو سیاسی غلامی سے کہیں زیادہ کمیونزم سے خطرہ ہے۔ وہ مسلمان رہ کر کمیونزم طرز زندگی قبول نہیں کر سکتے۔ لہٰذا روس سے استمداد کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ اول تو مطلوبہ مدد کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے جو بھی مدد ملے گی اس کے ساتھ سیاسی استیلا اور تصوراتی آمریت لامحالہ آئیں گے۔ مسلمان یہ سودا کبھی نہیں کر سکتے۔

روس کے مقابلہ میں امریکہ ہے۔ امریکہ دوست ممالک یورپی اور ایشیائی دونوں کی مدد کرتا چلا آ رہا ہے۔ اس کی مدد معاشی بھی ہے اور عسکری بھی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس نے جس نیت سے بھی مدد دی ہو۔ اس سے علاقہ سیاسی غلامی آئی۔ نہ تصوراتی آمریت کا سوال پیدا ہوا۔ سطور بالا کے بعد اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ مسلمان ممالک کا مفاد امریکہ سے معاہدہ کرنے میں ہے۔ لیکن اس کے خلاف دو اعتراضات گنئے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ امریکہ سے مالطہ پیدا کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ جن استعماری اثرات سے مشرق وسطیٰ کے ممالک آزاد ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں۔ وہ پھر سے عود کر آئیں گے۔ اس اعتراض کی حیثیت جذباتی ہے۔ دو آزاد قومیں جنھیں اپنے فوائد اور نقصانات کا مناسب شعور ہو اپنے اپنے مفاد کی خاطر ایک دوسرے کی معاہد ہو سکتی ہیں بین الاقوامی میدان میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے اس میں استعماریت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم کمزور ہوتے ہوئے اس معاہدے کو پوری طرح مفید مطلب نہیں بنا سکیں گے۔ یہ ایک حد تک درست ہے۔ لیکن اس کا علاج موجود ہے۔ امریکہ سے استمداد کا یہ مطلب نہیں کہ وہ یکطرفہ ہو اور ہم اس کے ضمیمہ بردار بن جائیں۔ ہم امریکہ سے مدد لیتے ہیں تو اسے اپنی مدد پیش بھی کرتے ہیں۔ ہمیں امریکہ کی ضرورت ہے تو امریکہ کو ہماری بھی ضرورت ہے۔ لہٰذا ہمارے معاہدے کا مطلب یہ ہے کہ تم ہماری مدد کرو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ اس سودے سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے لئے مسلمانوں کو متحد ہونا چاہیئے وہ متحد ہو کر ہی عمومی مطالبات مرتب کر کے امریکہ سے منوا سکتے ہیں۔ امریکہ اس اتحاد کو کبھی نہیں ٹھکرا سکے گا۔ کیونکہ اسے مسلمان ممالک سے جو فوائد حاصل ہو سکتے ہیں وہ اسی اتحاد کے ذریعے حاصل ہو سکتے ہیں۔ وہ یقیناً اس اتحاد سے سودا کرے گا۔ اور اس کا اپنی غرض کے لئے احترام بھی کرے گا۔ وہ جتنا اس کا احترام کرے گا ہم اتنا ہی اس سے فائدہ حاصل کر سکیں گے۔ گویا تنہا معاہدہ کرنے میں ایک ملک کے لئے جس خطرے کا احتمال ہو سکتا ہے۔ متحدہ صورت میں اس کا امکان باقی نہیں رہے گا۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ اس وقت مراکش میں امریکہ کے فوجی اڈے ہیں۔ یہ اڈے اسے فرانس کی وساطت سے ملے ہیں۔ ظاہر ہے کہ امریکہ اڈوں کی خاطر اس کا ممنون ہوگا کہ جس فرانس نے اسے اڈے دیئے ہیں وہ موجود رہے تاکہ اس کا مفاد بھی محفوظ رہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ امریکہ مراکش پر استعماری فرانس کے تسلط کے حق میں ہے۔ اگر کسی طرح یہ صورت پیدا ہو جائے کہ امریکہ مطلوبہ مراعات ہم سے براہ راست حاصل کر سکے تو وہ فرانس کے بجائے ہمارے پاس آئے گا۔ اور ہمارے ساتھ معاملے کرے گا۔ ہم اس وقت اس سے اپنے مفاد کی رو سے برابری کا سودا کر سکیں گے۔ ہم ایک مرتبہ اس قسم کی تنظیم پیدا کر لیں۔ تو بین الاقوامی میدان میں ہماری ساکھ بڑھ جائے گی۔ اور بڑی قومیں ہمارے ساتھ بہتر بلکہ مساویانہ سلوک روا رکھنے پر مجبور ہو جائیں گی۔

دوسرا اعتراض امریکہ سے معاہدے پر یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم روس کی کمیونزم کے خلاف ہیں تو امریکہ کی سرمایہ داری کو بھی اسلامی نہیں سمجھتے۔ لہٰذا اسلام اور سرمایہ داری کا گٹھ جوڑ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ اعتراض بدیہی طور پر غلط ہے کیونکہ امریکہ نہ نظام سرمایہ داری کا سودا کر رہا ہے اور نہ وہ اپنے معاہد ممالک پر اس نظام کو مسلط کرنے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے نیز اس سے معاہدہ کرنے سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اس کے نظام کو بھی قبول کریں یا اسے اسلامی قرار دے لیں۔ ہم اس سے معاہدہ کرنے کے باوجود اپنے ہاں اسلامی اصولوں کے نفاذ میں آزاد ہوں گے۔ امریکہ سے معاہدے میں آئیڈیالوجی کا سوال اگر آتا ہے تو صرف اس قدر کہ وہ بھی کمیونزم کا حریف ہے۔ اور ہم بھی۔ وہ سیاسی مصلحت کے تحت کمیونزم کو روکنا چاہتا ہے تو ہم دینی اعتبار سے اس کے خلاف ہیں یعنی امریکہ اگر کل اس مخالفت کو ترک بھی کر دے تو لادینیت کے اس سیلاب سے ہمارا تصادم بہر حال ہوگا۔ یہ طوفان بلا جس زور سے آ رہا ہے ہم اس کے تنہا حریف نہیں ہو سکتے۔ لیکن امریکہ جیسے بڑے ملک کی مدد ہمیں حاصل ہو جائے تو ہمارا کام سہل ہو جائے گا۔

سطور بالا سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ مسلمانان عالم کی اولین ضرورت باہمی اتحاد ہے۔ اس اتحاد کے بل بوتے پر وہ ہر بڑی قوم سے مساویانہ معاہدہ کر سکتے ہیں اور اپنی معاشی پسماندگی اور عسکری کمزوریوں کا مداوا کر سکتے ہیں لیکن یہ مدد انھیں تن تنہا امریکہ سے مل سکتی ہے کہیں اور سے نہیں۔ گویا مسلمانان عالم کو متحد ہو کر اپنے مفاد کی خاطر امریکہ سے معاہدہ کرنا چاہیئے۔ اس طرح بین الاقوامی میدان میں انھیں بڑا قوی دوست مل جائے گا۔ اور وہ اس کی مدد سے اپنی حالت بھی بہتر بنا سکیں گے اور مظلوم مسلمانوں کی مدد کو بھی پہنچ سکیں گے۔

مندرجہ بالا بنیادوں پر ایک تحریک شروع ہو چکی ہے۔ اور ترکی اور عراق اور ترکی اور پاکستان ایسے معاہدے کر چکے ہیں جو وحدت عالم اسلامی کی اساس بن سکتے ہیں۔ لیکن اس اقدام کی بھی مخالفت کی گئی ہے۔ اس مخالفت کے اسباب وہی ہیں جو اوپر بیان کئے گئے ہیں۔ اس معاہدے کی مخالفت میں پیش پیش مصر ہے۔ اب تک اس مخالفت سے اغیار کے مفاد ہی کو فائدہ پہنچا ہے کیونکہ اس سے وحدت عمل کی رفتار بھی سست ہو گئی ہے۔ اور مصر عمومی مفاد کو دیکھتا یا اب بھی دیکھ لے تو یہی معاہدہ اس حکمت عملی کی اساس ثابت ہو سکتا ہے۔ جس کا خاکہ اوپر پیش کیا گیا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں ممالک اسلامیہ کے لئے بالعموم اور مصر اور دیگر ممالک عربیہ کے لئے بالخصوص اس سدی پالیسی پر نظر ثانی کرنے کا عمدہ موقعہ آ گیا ہے۔ امریکہ نے حال ہی میں چند تجاویز پیش کی ہیں۔ یہ تجاویز یہودیوں سے پیدا شدہ کشیدگی کو کم کرنے کی نیت سے کی گئی ہیں۔ تجاویز مختصراً یہ ہیں (۱) یہودی عرب مہاجرین کو معاوضہ دیں (اگر اس کے لئے انھیں سرمایے کی ضرورت ہو تو امریکہ مدد کے لئے تیار ہے) (۲) سرحدی تنازعات کو کم کرنے کے لئے سرحدات کا از سر نو تعین کیا جائے (۳) نئی سرحدوں کو توڑنے والوں کے خلاف اجتماعی کارروائی کی جائے عربی نقطہ نگاہ سے یہ تجویز بوجوہ ناقابل تسلیم ہے۔ لیکن سوال اس کے موجودہ شکل میں قابل قبول یا قابل استرداد ہونے کا نہیں بلکہ غور طلب بات یہ ہے کہ امریکہ نے عمومی تصفیے کے لئے سلسلہ جنبانی کی ہے۔ اور اگر اس وقت مسلمان ایک مرکز پر جمع ہو جائیں۔ اور وہ ایک متفقہ لائحہ عمل تیار کر لیں تو وہ اس کی بنا پر امریکہ سے معاملہ کر سکتے ہیں۔ موجودہ تجویز حرف آخر نہیں۔ باہمی اتحاد اور مزید مذاکرات سے اس میں اپنے مفاد کے مطابق مناسب ترمیمات کی جا سکتی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم متحد ہو گئے تو امریکہ ہمارے مطالبات ماننے پر مجبور ہو جائے گا۔ اور بدسلوکی کرنا تو درکنار ہم سے بے اعتنائی

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

مجلسِ اقبال

مثنوی اسرارِ خودی
(باب اول۔ مسلسل)

اس کے بعد ارشاد ہے۔

سبزہ چوں تاب دمید از خویش یافت — ہمتِ او سینۂ گلشن شگافت

سبزہ کی ہستی کیا ہے؟ ایک پرکاہ۔ لیکن یہ پرکاہ جب استحکامِ خویش سے اپنے اندر نشوونما کی قوت فراہم کرلیتا ہے تو وہ سینۂ چمن کو چیر کے باہر نکل آتا ہے۔

شمع ہم خود را بخود زنجیر کرد — خویش را از ذرہ ہا تعمیر کرد

شمع کیا ہے؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ روشنی نے اپنے اوپر کچھ پابندیاں عاید کرلی ہیں۔ مختلف ذرات موم کی شکل میں اکٹھے ہوئے۔ مختلف ریشوں نے اکٹھا ہوکر تاگے کی شکل اختیار کرلی۔ اس سے شمع وجود میں آئی۔ اب رہی اسکی روشنی، سو سائنسداں ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ ہم روشنی کو اس لئے دیکھ پاتے ہیں کہ وہ فضا میں پھیلے ہوئے بیشمار ذروں کو منور کرتی ہے جسے ہم روشنی کی کرن کہتے ہیں وہ درحقیقت یہی چمکتے ہوئے ذرات ہوتے ہیں۔ جنھیں ہماری آنکھ دیکھتی ہے۔ لہٰذا جسے ہم شمع اور اس کی روشنی کہتے ہیں۔ وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند ذرات نے اپنے اوپر نظم وضبط اور آئین و قوانین کی پابندیاں عاید کر رکھی ہیں۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ :۔

خود گدازی پیشہ کرد از خود رمید — ہمچو اشک آخر ز چشمِ خود چکید

مختلف ذرات جمع ہوئے تو وہ شمع بن گئے۔ لیکن جب شمع نے اپنے آپ کو پگھلانا شروع کردیا۔ تو اس کا مقام اس سے چھن گیا۔ اور وہ اس طرح نابود ہوگئی جیسے آنکھ سے آنسو ٹپک کر زمین میں جذب ہوجاتا ہے۔ اور اپنی ہستی کھو دیتا ہے۔

گر بہ فطرت پختہ تر بودے نگیں — از جراحت ہا بیاسودے نگیں

اگر وہ پتھر جس سے نگینہ بنایا جاتا ہے۔ اپنی فطرت میں پختہ اور مستحکم ہوتا تو نقاش اس میں کسی قسم کا نقش نہ پیدا کرسکتا۔ لیکن چونکہ وہ نقاش کے نشتر کے مقابلہ میں کمزور ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں غیر کا نام کھُد جاتا ہے۔ اور وہ عمر بھر دوسروں کے نام کو اپنے کاندھے پر لئے پھرتا ہے۔ اور اس بے غیرتی سے اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔

یشود سرمایہ دارِ نام غیر — دوشِ او مجروح بارِ نام غیر

اس کے بعد ایک اور مثال دیتے ہیں۔

چوں زمیں بر ہستیِ خود محکم است — ماہ پابندِ طواف پیہم است

چونکہ زمین اپنی ذات میں محکم ہے۔ اس لئے چاند ہمیشہ اس کے گرد طواف کرتا رہتا ہے۔

ہستیِ مہر از زمیں محکم تر است — پس زمیں مسحورِ چشمِ خاور است

چونکہ سورج کی ہستی زمین سے زیادہ محکم ہے۔ اس لئے زمین سورج کے گرد دیوانہ وار چکر کاٹتی ہے۔

جنبش از مژگان بَرد شانِ چنار — مایہ دار از سطوتِ او کوہسار

تار و پودِ کسوتِ او آتش است — اصلِ او یک دانۂ گردن کش است

چنار کو دیکھئے۔ اس قدر بلند و بالا کہ ایک دفعہ اس پر نگاہ پڑجائے۔ تو پھر آنکھ جھپکنے کو جی نہیں چاہتا۔ انسان محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ اس نے یہ شان و عظمت کہاں سے پائی؟ ایسی شان و عظمت کہ جو خود کوہسار کے لئے وجۂ شوکت و حشمت ہو۔ اس کی لکڑی۔ تنا۔ چھال۔ غرضیکہ اس کے پیکر کی ساری پوشاک آتشیں ہوتی ہے۔ لیکن اس کی اصل ایک ننھا سا بیج ہوتا ہے۔ جو زمین کی مٹی میں دب کر سرنگوں نہیں ہوجاتا۔ بلکہ پوری قوت سے اپنی گردن اٹھاتا ہے۔ سینۂ زمین کو شق کرکے باہر آتا ہے۔ اور اپنے زور و کردار سے اس قدر بلند و بالا چنار بن جاتا ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ

چوں خودی آرد بہم نیروئے زیست — می کشاید قلزمے از جوئے زیست

جب خودی زندگی کی توانائیوں کا باعث بن جاتی ہے۔ اور ان کو یکجا کرکے کسی ایک پیکر میں جمع کردیتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کی ایک جوئے تنگ، ساحل ناآشنا سمندر میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ کائنات میں استحکام اور وسعت، خودی کے زور پر ہوتی ہے۔ اگر خودی ضعیف ہو تو نہ زندگی میں توانائی ہوتی ہے نہ وسعت۔

اس شعر پر اسرارِ خودی کا پہلا باب ختم ہوتا ہے۔

باب دوم

دربیان ایں کہ حیاتِ خودی از تخلیق و تولیدِ مقاصد است

گزشتہ باب میں حضرت علامہ یہ بتا چکے ہیں کہ یہ تمام کائنات اور زندگی سب، خودی کی نمود ہے۔ جس قدر خودی مستحکم ہوتی ہے۔ اسی قدر زندگی میں قوت اور توانائی ہوتی ہے۔ جس کی خودی ضعیف ہوجائے اسے نہ سرفرازی نصیب ہوسکتی ہے۔ اور نہ توانائی۔ اب اس باب میں وہ یہ بتاتے ہیں کہ خود خودی کی حیات کا راز کس بات میں ہے۔ اس سوال کے جواب میں حضرت علامہ نے جو کچھ کہا ہے وہ درحقیقت ان کے پورے فلسفہ کا نقطۂ ماسکہ اور ان کے سارے پیغام کا مرکز فکر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کے سامنے زندگی کا ایک متعین مقصد ہونا چاہیئے۔ اور پھر اس مقصد کے حصول کی تڑپ، ان کے نزدیک خودی کی زندگی کا دارومدار تخلیق مقاصد پر ہے۔ جس قدر مقاصد ہمارے سامنے ہونگے اسی نسبت سے ہماری خودی زندہ توانا اور پائندہ ہوگی۔ مقصد کے حصول کی تڑپ کا نام ان کی اصطلاح میں آرزو ہے۔ تعین مقصد فی ذاتہ بے معنی چیز ہے۔ اگر اس کے بعد اس کے حصول کی تڑپ انسان کے دل میں نہیں ہے۔ لہٰذا خودی کی زندگی کا راز مقاصد اور آرزوؤں کے اندر ہے۔ ان کے نزدیک ہر وہ تصورِ حیات جو کائنات اور انسانی زندگی کو بے مقصد بتاتا ہے یا جو انسان کو ترکِ آرزو یا ترکِ عمل سکھاتا ہے۔ وہ باطل ہے۔ اور انسانیت کے لئے ہلاکت کا موجب۔ اس اعتبار سے بدھ مت کا فلسفہ جو یہ بتاتا ہے کہ ترکِ آرزو ہی مقصدِ حیات ہے۔ کیونکہ ہر آرزو ایک تکلیف کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اور جب تک انسان آرزوؤں کے بندھن سے چھٹکارا حاصل نہ کرلے۔ اسے نجات نہیں مل سکتی۔ یکسر باطل ہے۔ اسی طرح فلسفۂ ویدانت جو خودی کی نفی کو عین حیات کہتا ہے اور ترکِ علائق کو اس کے حصول کا ذریعہ بتاتا ہے۔ غیر حق ہے۔ ہمارا تصوف بھی اسی فلسفہ کی دوسری شکل ہے اس لئے یہ بھی حق کے خلاف ہے۔ قرآن اس حقیقتِ کبریٰ کا بار بار اعلان کرتا ہے کہ ہم نے پوری کی پوری کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ اسے یونہی بطور کھیل تماشا کے پیدا نہیں کردیا۔ اس کے برعکس ہندو فلسفہ کہتا ہے کہ یہ ساری کائنات ایشور کی لیلا ہے۔ یعنی محض ایک ناٹک جس میں خود خدا سب سے بڑے ایکٹر کا پارٹ ادا کررہا ہے۔ اس لئے ان کے ہاں ایشور کو نٹ راجن بھی کہتے ہیں۔ یعنی کھلاڑیوں کا بادشاہ۔ قرآن اس تصور کی سختی سے تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ کائنات کی تخلیق کھیل تماشے کے لئے نہیں ہوئی۔ اسے ایک متعین مقصد کے ماتحت پیدا کیا گیا ہے۔ اسی طرح وہ کہتا ہے۔ کہ انسان کی زندگی بھی بے مقصد نہیں ہے۔ اس کے سامنے ایک عظیم مقصد ہے۔ جس کا حصول اسکی کامیابی ہے۔ اسی مقصد پر یقینِ محکم کو وہ ایمان قرار دیتا ہے۔ اور اسی کے حصول کے لئے جو قدم اٹھایا جائے۔ اسے عملِ صالح کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ انہی کو اقبال مقصد اور آرزو کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔

چنانچہ وہ کہتا ہے کہ

زندگانی را بقا از مدعا است — کاروانش را درا از مدعا است

زندگی کے استحکام اور بقا کا راز مقصد اور مدعا کے اندر ہے۔ یہی وہ جذبۂ محرکہ ہے۔ جو اس کے قافلہ کے لئے بانگِ رحیل، یعنی قافلہ کی روانگی کی گھنٹی بنتا ہے۔ اگر مقصد و مدعا نہ ہو تو انسانی زندگی میں کوئی حرکت پیدا نہ ہو اور جب حرکت پیدا نہ ہو تو خود زندگی بھی باقی نہ رہے۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصلِ او در آرزو پوشیدہ است

زندگی نئے نئے راستوں کی تلاش کا نام ہے جو انسان کو اس کے مقصد کی طرف لے جاتے ہیں اور یہ تلاش حصولِ مقصد کی تڑپ کے بغیر ناممکن ہے۔ اسی کو آرزو کہتے ہیں۔

عورت کا قرآن

(۲۵)

مولانا اسلم جیراجپوری کی تالیف "تعلیمات قرآن" پر تنقید کرتے ہوئے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے حافظ اسلم صاحب کے اس دعویٰ کی کہ اسلام نے غلامی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے اسی بنا پر تردید کی اور فیصلہ دیا کہ حافظ صاحب نے غلط فرمایا ہے کہ اسلام نے "غلامی" کو ختم کر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

"مؤلف کی غلطی کا اصلی سبب یہ ہے کہ انھوں نے صرف قرآن سے غلامی کا قانون اخذ کرنے کی کوشش فرمائی ہے"۔

(تفہیمات حصہ دوم صفحہ ۲۹۲)

اس میں کیا شبہ ہے! ایک مسلمان کی اس سے بڑی غلطی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ "قرآن" کو مکمل ضابطہ حیات سمجھ کر زندگی کے قانون صرف اسی سے اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے؟ بہرحال، قرآن مجید نے "غلامی" کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا ہے۔ لہٰذا کوئی "مرد" کبھی کسی حالت میں بھی "غلام" بنایا جا سکتا ہے۔ اور نہ کوئی عورت چاہے وہ جنگ ہی میں کیوں نہ ہو، قید کر کے "لونڈی" بنائی جا سکتی ہے۔ اور اب جبکہ کوئی عورت لونڈی بنائی ہی نہیں جا سکتی تو اس سے نکاح کا مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لونڈی کے سلسلہ میں ایک اور بات ملاؤں نے گھڑ رکھی ہے۔ اور وہ یہ کہ "لونڈی سے نکاح کئے بغیر "تمتع" حاصل کیا جا سکتا ہے۔ نہ صرف اتنا ہی بلکہ "لونڈی" کے لئے چار کی حد بھی ضروری نہیں ہے۔ مولانا مودودی صاحب سے کسی نے سوال کیا کہ:-

لونڈیوں سے بلا نکاح "تمتع" شہوت رانی ہے اور اسلام اس کے خلاف ہے۔

تو انھوں نے فرمایا کہ:-

"اسلامی شریعت میں نکاح کے لئے تو چار کی حد مقرر ہے۔ لیکن لونڈیوں کے لئے کوئی حد رکھی ہی نہیں۔ . . . لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کی قید اس لئے نہیں لگائی گئی کہ ان عورتوں کی تعداد کا کوئی تعین ممکن نہیں ہے جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر آ سکتی ہیں"۔ (تفہیمات حصہ دوم صفحہ ۳۱۹ و ۳۲۴)

"جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کے لئے . . . . . اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو عورت حکومت کی طرف سے جس شخص کی ملکیت میں دی جائے اس کے ساتھ اس شخص کو جنسی تعلقات قائم کرنے کا قانونی حق دیدیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یہ عورتیں ملک میں بداخلاقی پھیلانے کا ایک مستقل ذریعہ بن جاتیں"۔ (صفحہ ۳۲۳)

"حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے . . . . تو انھیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے اور سپاہی انھیں اپنے استعمال میں لائیں"۔ (صفحہ ۳۴۰)

"حق ملکیت کی بنا پر تمتع کی اجازت، قرآن مجید کی متعدد آیات میں صریح طور پر وارد ہوئی ہے"۔ (صفحہ ۳۰۸)

ذرا سوچئے یہ ایک "مسلمان" عالم کی تحریر ہے۔ جو تمام مسلمانوں کے قائد اور راہنما بنتے ہیں۔ اور جس میں عورت کو بھیڑ بکری سے بھی زیادہ ذلیل و حقیر سمجھ کر اس سے تمتع، بلا معاوضہ تمتع، بلا تعداد تمتع حاصل کرنے کی اجازت پر "قرآن مجید" کو گواہ بنایا جا رہا ہے۔ اب ذرا ایک "ہندو" کی تحریر ملاحظہ ہو۔ جو مولانا مالک رام اپنی کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" میں فرماتے ہیں:-

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایسی لونڈیوں سے باقاعدہ نکاح کی ضرورت نہیں انھیں نکاح کے بغیر ہی بیوی کی طرح رکھ لیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ معنی قرآن اور خود سنت رسول اللہ صلعم کے خلاف ہیں۔ اسی سورۂ نساء میں آگے چل کر حکم ہوتا ہے:-

اور اگر تم میں سے کسی کو استطاعت نہ ہو کہ وہ آزاد مومنہ عورتوں سے نکاح کر سکے تو وہ ان مومنہ لونڈیوں سے نکاح کرے جو جنگ میں اسیر ہو کر تمہارے قبضہ میں آ گئی ہیں"۔ (نساء ۴)

یہ حکم اس لئے دیا کہ محض اس وجہ سے کہ یہ عورتیں شامت اعمال سے قیدی ہو کر تمہارے قبضے میں آ گئی ہیں۔ تم ان سے نفرت نہ کرو۔ اور انھیں اپنے نکاح میں لے لو۔ . . . . خود رسول کریمؐ نے حضرت صفیہ سے جو مذہباً یہودیہ تھیں۔ اور غزوۂ خیبر میں اسیر ہو کر آئی تھیں۔ اور حضرت جویریہ سے جو بنی مصطلق کے امیر حارث کی بیٹی اور غزوہ مصطلق میں قید ہوئی تھیں نکاح کیا[1]۔ قرآن نے لونڈیوں سے نکاح کی شرائط بھی بیان کر دی ہیں:-

"انھیں ان کے سرپرستوں کی اجازت سے اپنے نکاح میں لاؤ۔ اور دستور کے مطابق ان کے مہر ان کے حوالے کر دو"۔ (نساء ۴)[2]

گویا اول ان کے مالک کی اجازت ہو۔ دوم انھیں بھی مہر ادا کرو۔ بالکل ظاہر ہے کہ ان کا مہر آزاد عورت سے نسبتاً کم ہوگا۔ اور اگر خود مالک ہی اس سے نکاح کرے تو وہ بغیر مہر کے بھی ایسا کر سکتا ہے۔ کیونکہ لونڈی اس کی ملکیت ہے۔ لونڈی کی آزادی ہی اس کا مہر ہوگی۔ جیسے کہ خود حضرت رسول کریمؐ نے حضرت صفیہ بنت حیی کے معاملہ میں کیا۔ . . . . یہ درست ہے کہ قرآن لونڈی سے لونڈی کی حیثیت میں رہتے ہوئے نکاح کو زیادہ پسند نہیں کرتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فسق و فجور کی زندگی پسند کرتا ہے بلکہ اس نے "لَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ" (نور) کہہ کر انھیں زنا پر مجبور کرنے سے منع کیا ہے۔ اور نکاح کے بغیر تعلقات زناشوئی قائم کرنا زنا ہے۔ . . . .

دیکھا؟ ایک مسلمان عالم "اسلام" کا قانون یہ بیان کرتا ہے کہ "لونڈی سے بلا نکاح تمتع جائز ہے۔ اور قرآن کو گواہ بناتا ہے۔ مگر ایک ہندو جب قرآن کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ از روئے قرآن نکاح کے بغیر تعلقات زناشوئی قائم کرنا زنا ہے۔ بہرحال اسلام میں اب از روئے قرآن نہ تو کوئی عورت "لونڈی" بنائی جا سکتی ہے۔ اور نہ اس سے بلا نکاح تمتع حاصل کیا جا سکتا ہے۔

پسندیدہ عورت سے نکاح

نکاح کے لئے قرآن مجید نے بتایا ہے کہ "پسند کے مطابق" ہونا چاہیئے۔ بالفاظ دیگر "مرد" کو حکم دیا گیا ہے کہ جو "عورت" تم کو پسند ہو۔ اس سے نکاح کرو۔ پسندیدگی کا انحصار ہے "عورت" کو دیکھنے پر۔ یعنی پسند ناپسند کا فیصلہ عورت کو دیکھے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ اور ایسی عورت کو دیکھنا جس کو دیکھ کر نکاح کا فیصلہ کرنا ہے اسی وقت ممکن ہے جب بقول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ خود "عورت" کی بھی مرضی ہو، یعنی عورت کو نکاح اور اس کی اہمیت کا پورا پورا علم اور احساس ہو۔ اس طور پر گویا "قرآن مجید" صغیرسنی کی شادی کو جائز نہیں قرار دیتا۔ نیز اسلام میں ایسا پردہ جائز نہیں رکھتا کہ کوئی مرد کسی عورت کو دیکھ ہی نہ سکے۔ نیز اسلام عورت اور مرد دونوں کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر اور پسند کر کے ہی نکاح کریں۔ مگر برخلاف اس کے اگر مغرب میں "کورٹ شپ" کا رواج ہو گیا تو مشرق میں یہ دستور ہو گیا کہ عورت بے دیکھے سنے، بے جانے بوجھے بلکہ بلا علم و واقفیت کسی کی بیوی بن جائے یا بنا دی جائے۔ حالانکہ دیکھنے کی اجازت دینے میں مصلحت یہ بھی کہ مرد اور عورت دونوں اپنے اپنے رفیق حیات اور شریک زندگی کی عمر نیز ان کے ظاہری حسن و عیب اور شکل و صورت سے واقف ہو جائیں۔ تاکہ ان میں ہمیشہ خوشگوار تعلقات قائم رہیں۔ اور ایسا نہ ہو کہ بے دیکھے نکاح کر لیں اور اس طرح نکاح کے بعد دیکھا ہو تو کوئی ظاہری حسن و عیب انکی ناگواری کا باعث ہو اور اس طرح "نہ دیکھنا" ان کے درمیان بجائے مفارقت اور سبب جدائی بن جائے۔

اسلامی معاشرت
مسلمان کے اخلاق و عادات کا خاکہ
قیمت:- دو روپے

[1] اگر واقعی "لونڈی" یا اسیر جنگ عورت سے نکاح ضروری نہیں تو رسول اللہ صلعم نے ایسا کیوں کیا؟ [2] بھلا اس واضح حکم کے بعد کیسے کہا جاتا ہے کہ "لونڈی" سے نکاح ضروری نہیں۔

اسلامی نظام میں مال کی حیثیت

(از:- محترم محب الدین خطیب مصری)

محترم خطیب مصری کا یہ مضمون، قاہرہ کے ماہوار مجلہ الازہر میں شائع ہوا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ صاحب مضمون کے سامنے قرآن کا وہ نظام نہیں جس میں مال کا صحیح صحیح مقام متعین ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس نظام کا کوئی متعین نقشہ تاریخ پیش نہیں کرتی اور قرآن کو صحیح طور پر سمجھا نہیں جاسکتا جب تک اسے روایات سے بلند تر تصور نہ کیا جائے۔ باایں ہمہ، اس مضمون میں انہوں نے کوشش کی ہے کہ مال کو ملت کی اجتماعی بہبود کا ذریعہ قرار دیا جائے۔ ہم اس مضمون کو اس غرض سے شائع کر رہے ہیں کہ یہ معلوم ہو سکے کہ مصر جیسے مذہبی اعتبار سے سخت قدامت پسند ملک میں بھی اب فکری رجحانات کیا ہیں اگر اسے اس نقطۂ نگاہ سے پڑھا جائے تو ہمارا خیال ہے کہ اس کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں ہوگا۔ (طلوع اسلام)

مجلہ لائف (امریکہ) نے لکھا ہے کہ

"اسلام محض ایک رسمی دین نہیں۔ یہ ایک زندگی کا نظام ہے، فلسفہ ہے اور مدافعت کن قوت ہے جس کی نظیر مغربی دنیا میں نہیں مل سکتی"

اسلامی صحافت پر لازم ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اسلام کے متعلق اہل مغرب کو بتاتے رہیں کہ اسلام کس طرح ایک نظام زندگی ہے اور کس طرح ایک مدافعت کن قوت ہے تاکہ وہ اپنی اجتماعیت کو اسلام کی راہوں کی طرف متوجہ کر سکیں جس کے راستے ان کی استعماریت برابر روک بنکر کھڑی ہوئی رہتی ہے۔ نیز اس لئے کہ وہ یک جہتی کے ساتھ اسلام کی طرف بڑھ سکیں کیونکہ وہ آج تک الگ الگ مختلف راستوں میں بھٹکتے رہے ہیں۔

نظام اسلام کے لفظ سے ابتداءً ذہن انسانی جس چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ اسلام کا مالی نظام ہے۔ اس لئے کہ یہی وہ چیز ہے جو انسان کو سب سے زیادہ اپنی طرف جذب کئے رکھتی ہے اور یہی وہ مطلوب ہے جسے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کیلئے ہر انسان مشقتیں برداشت کرتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ حصول مال کے لئے سرگرداں رہتے ہیں ان کے لئے اس بات کا علم ہو جانا بہتر ہوگا کہ اس باب میں اسلام کا حکم کیا ہے۔ تاکہ ان کی کد و کاوش اسلامی طریق کار کے مطابق ہو اور اس طرح وہ دوہری سعادت کو جمع کر لیں۔ یعنی دنیا کی سعادت کو بھی اور آخرت کی سعادت کو بھی۔

انسانیت آج تک کسی ایسے نظام سے روشناس نہیں ہوئی جو نظام اسلام سے زیادہ دقیق تر اور عظیم تر ہو۔ یہ نظام ہر مسلمان پر اس بات کو واجب قرار دیتا ہے کہ وہ تحصیل مال میں حق کی جستجو اور پاکیزگی کی تلاش کرے۔ تاکہ وہ مال اسلامی نقطۂ نظر سے مال حلال ہو سکے۔ اس بارہ میں رسول اللہ صلعم کے ارشادات و اوامر اور صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم کی سیرتوں میں ان ارشادات کے عکسی نمونے اتنی مقدار میں ملتے ہیں کہ ان سے مستنبط شدہ احکام فقہ اسلامی اور آداب شرعیہ کی ضخیم کتابوں کے معتد بہ حصہ پر پھیلے ہوئے ملتے ہیں۔

مال کے بارہ میں اسلامی نظام کے حقائق میں سے پہلی حقیقت تو یہ ہے کہ وہ مال کو زندگی کا مقصد اور غایت بنا لینے کے سرچشمہ ہی کو چیلنج کرتا ہے تاکہ لوگ اسکی تحصیل اور ذخیرہ اندوزی میں اس حد تک نہ پہنچ جائیں جسے عام اصطلاح میں دولتمندی یا مالداری کہا جاتا ہے۔ دولتمندی یا مالداری ایک مبہم لفظ ہے جس کا نہ کوئی ثابت شدہ مفہوم ہے اور نہ ہی اس کی حدود متعین ہیں۔ کیونکہ ہر غنی آدمی اپنے سے غنی تر کے مقابلہ میں فقیر ہوتا ہے۔ اور ہر فقیر اپنے سے فقیر تر کے مقابلہ میں غنی ہوتا ہے۔ لہٰذا حصول غنا کے لئے مشقتیں برداشت کرنا اس اعتبار سے کہ مال ہی اس کا منتہیٰ و مقصود ہے — تمام مشقتیں برداشت کرنیوالوں کو اس حد تک تو پہونچا نہیں سکتا کہ ہر مشقت کرنیوالا دنیا کے ہر غنی سے زیادہ غنی تر ہو جائے نتیجہ یہی ہوگا کہ ہر مشقت کرنے والا اپنے سے غنی تر کے مقابلہ میں فقیر ہی رہیگا۔ اس طرح انسانی کاوشیں ایک بیہودہ مطلوب کی تلاش میں ضائع ہوتی رہیں گی۔ اس کے پیچھے دوڑنا ایسا ہی ہوگا جیسا کوئی شخص گرداب کے ساتھ دوڑ لگانے کی کوشش کرے اس کے ساتھ دوڑنے میں کسی کو راحت نصیب نہیں ہو سکتی۔ کوئی جس قدر اس کے ساتھ دوڑنے کی کوشش کرے گا اتنا ہی وہ سعادت سے دور ہوتا چلا جائیگا۔ اور کسی ایک مقام پر ٹھہر جانے کے خوشگوار احساس سے بھی محروم ہو جائیگا۔

بلاشبہ غنا اور مالداری، اکثر فوں اور سرکشی ہوتی ہے اور یقیناً فقر کفر سے قریب تر منزل کا نام ہے۔ جو عداوتیں لوگوں کے درمیان بلکہ بسا اوقات ایک ہی خاندان کے افراد کے درمیان پیدا ہوتی ہیں وہ زیادہ تر مال کی محبت اور اس کو زندگی کا منتہیٰ اور مقصود بنا لینے اور بقدر ضرورت سے زیادہ مال کی ذخیرہ اندوزی میں مسابقت کی کوششوں ہی سے ہوتی ہیں۔ کبھی یہ مسابقت لوگوں کے درمیان حد سے بڑھ جاتی ہے چنانچہ لوگ دوسروں پر ظلم کرنے لگتے ہیں۔ اور ان کی واقعی اور جائز ضروریات تک پر چھاپہ مارنے لگتے ہیں انسانوں کی اجتماعیت جب اپنے لئے خود کوئی نظام تجویز کرتی ہے تو کوئی سا بھی نظام ہو اس میں انسانوں کی ایک دوسرے پر مال کی طلب میں ان زیادتیوں کو ہلکا سا جرم شمار کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ جس نظام میں مال کو زندگی کا منتہیٰ و مقصود ٹھہرا لیا جائے اس میں قدرۃً انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں رہتی اور یہ جذبہ اس نظام میں زندگی بسر کرنے والوں کو ایک ایسے زیب آلود نشاط کی طرف دھکیل دیتا ہے جس کا مآل بڑا ہی دردناک ہوتا ہے ان پر اس سعادت کی تمام راہیں گم کر دیتا ہے، جو قناعت کے ساتھ کام کرنے والوں کے اطمینانِ قلب کا باعث ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے مال کو زندگی کا منتہیٰ اور مقصود نہیں بنایا بلکہ اسے حصولِ مقاصد کا ایک ذریعہ قرار دیا ہے۔ یہ فرد کے لئے زندگی میں اس کی ضروری حاجتوں کو پورا کرنے کا وسیلہ اور عافیت و اطمینان کے ساتھ خاندان اور قبیلہ کی خوشگواریوں کا ذریعہ ہوتا ہے اس تصور کے ماتحت انسان کے قدم، نشاط، قناعت اور دلپسندیدگی کے ساتھ سلامتی اور بقاء کی طرف برابر بڑھتے رہتے ہیں۔ پھر اس کے بعد وہ ایک نظم اجتماعی میں کسی صالح نظام کو قائم کرنے کے لئے جماعت اور مملکت کو بھی ایک ذریعہ کا کام دیتا ہے نیز عام اور مشترک سہولتیں بکثرت مہیا کر دینے کا اور ان مخالف محرکات کی مدافعت کا بھی ذریعہ ہوتا ہے جو اس نظم اجتماعی کے لئے خطرہ کا موجب ہوں

لہٰذا مال — ایک ذریعہ کی حیثیت سے — فرد کے لئے ضروری ہے اور اسلام نے مسلمانوں کو سعی، عمل اور کسب حلال کی ترغیب دلا کر اور انفرادی ملکیت کے حقوق کی ضمانت دے کر اس کے حصول کا شوق دلایا ہے نیز خاندان کے لئے بھی مال ضروری ہے۔ اسلام نے اس کے لئے نفقات کا ایک نظام قائم کیا ہے اور رشتہ داروں کے ساتھ مناسب سلوک کرنے کی فضیلت جتائی ہے۔ اسلام نے خاندانی بقاء کی فطری تمنا کا بھی احترام کیا ہے۔ اور ان کے لئے وراثت کا ایک نظام قائم کیا ہے۔ اس کے بعد جماعت اور مملکت کے لئے بھی مال کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ کا ایک نظام مقرر کیا اور اسے نماز، روزہ اور حج کی طرح اجتماعی عبادتوں میں سے ایک عبادت قرار دیا ہے[1]۔ اور چونکہ وسائل کی مقررا ورا ہمیت

---

[1] یہ جتنی باتیں اوپر کہی گئی ہیں، اسلام کے صحیح نظام میں یہ صرف عبوری دور سے متعلق ہیں۔ قرآنی نظام کے قیام کے بعد صورتِ حالات بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔ یہ نقطۂ صاحب مضمون کے سامنے نہیں۔ طلوع اسلام۔

اس چیز کو سامنے رکھکر ہی ہوسکتی ہے کہ وہ کس درجہ تک، ذریعہ اور وسیلہ ہے لہٰذا اسلام نے اس تفریق کی ہے کہ مال کس حد تک ایک فرد کی ضروریات زندگی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور وہ کونسی حد ہے جہاں پہنچکر وہ ذریعہ کی بجائے مقصود بن جاتا ہے اور وہ کونسا مقام ہے جہاں یہ مالداروں کے قبضہ میں بطورِ امانت کے رہتا ہے تاکہ اسے مصالح عامّہ میں خرچ کیا جا سکے بڑے ہی باریک فرق بتائیے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہوگا کہ اس کے جائز اور ناجائز استعمال کے درمیان حدودِ فاصل کیا ہیں۔ بلکہ مال کو زندگی میں ذریعہ ماننے اور زندگی کا منتہیٰ اور مقصد تسلیم کرنے میں حدودِ فاصل کیا ہیں ؟

امام نوویؒ نے بلند مرتبہ صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ کے سوانح حیات بیان کرتے ہوئے اپنی کتاب تہذیب الاسماء میں لکھا ہے کہ ابوذرؓ کا مسلک یہ تھا کہ مسلمان پر اس مال کا جمع کرنا جو اس کی ضرورت سے زیادہ ہو حرام ہے۔ حافظ ابو عمر بن عبد البرؒ نے "استیعاب" میں حضرت ابوذرؓ کے حالات لکھتے ہوئے کہا ہے کہ ابوذرؓ سے بہت سے ایسے آثار منقول ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مسلک یہ تھا کہ جو مال جمع کیا جائے اور وہ اس فرد کی غذا اور ضروریات زندگی سے زیادہ ہو۔ تو اس مال کا جمع کرنے والا قابل مذمت ہے۔ اور سورۂ توبہ کی یہ آیت کہ

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا
یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ
اَلِیْمٍ ۝ یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی
بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ ۔ ھٰذَا
مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ
تَکْنِزُوْنَ ۝

جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں مفادِ عامہ کے لئے اسے کھلا نہیں چھوڑ دیتے۔ اے پیغمبر اسلام! تم ایسے لوگوں کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔ جس دن جہنم کی آگ میں اس سونے اور چاندی کو تپایا جائے گا۔ اور پھر اس سے ان لوگوں کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں کو داغ دیا جائے گا اور کہا جائے گا۔ یہی تو ہے وہ سونا اور چاندی جسے تم اپنے لئے جمع کیا کرتے تھے۔ اب جو کچھ تم جمع کیا کرتے تھے اس کو چکھو۔ ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں نازل ہوئی تھی۔ لیکن جمہور صحابہؓ نے اور بعد کے لوگوں نے ابوذرؓ کی مخالفت کی اور انھوں نے اس وعید والی آیت کو زکوٰۃ روانہ کرنے والوں پر محمول کیا[1]

ابوذر غفاریؓ اس اُمتِ محمدیہ کے مسیح تھے جیسا کہ ان کے استادِ اعظم معلم الخیر جناب رسول اللہ صلعم نے ایک مرتبہ ان کی تعریف میں فرمایا تھا۔ ان سے پہلے ایسا ہی مسلک حضرت مسیح عیسیٰ ابن مریم صلوٰۃ اللہ علیہ وسلم نے بھی پیش کیا تھا جب کہ آپ نے فرمایا تھا۔

سوئی کے ناکے میں جہاز کے موٹے رسّے کا داخل ہو جانا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ ایک مالدار آدمی آسمانوں کی ملکوت میں داخل ہو سکے۔[2]

حضرت ابوذر غفاری اور ان کے دوسرے بھائیوں یعنی حضرات صحابہ کے درمیان مال کو وسیلہ قرار دینے اور مال کو منتہیٰ اور مقصد قرار دینے کی اس تحدید میں جو اختلاف پیدا ہوا وہ حضرت عثمان ذی النورینؓ کے عہدِ خلافت میں رونما ہوا۔ خود امیر المومنین حضرت عثمانؓ ان اغنیاء صحابہ میں سے تھے جن کی مالداری قحط سالیوں اور مصیبتوں میں پوری اُمت کا مداوا بن جایا کرتی تھی۔ جن کی مالداری پوری اسلامی فوج کو احاطہ کر لیتی تھی کہ جس مجاہد صحابی کے پاس سواری نہیں ہوتی تھی۔ اسے وہ سواری مہیا فرما دیتے تھے یہ کچھ اپنے اموال کی اس زکوٰۃ سے الگ ہوتا تھا جو ہر سال اسلامی بیت المال میں جمع کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے وہ بیشمار صدقات جن کو لوگوں کو علم بھی نہیں ہوتا تھا ان صدقات سے کہیں زیادہ ہوتے تھے جو منظرِ عام پر آ جاتے تھے۔ حضرت عثمانؓ ہی نہیں حضرت علیؓ کا بھی اپنی زندگی کے نصف آخر میں اغنیاء صحابہؓ میں شمار ہوتا تھا۔ ابن حزم نے کہا ہے کہ ینبع میں جو حضرت علیؓ کی زمین تھی اس سے کھیتی باڑی کے علاوہ صرف کھجوریں ایک ہزار وسق سالانہ آیا کرتی تھیں۔ محمد بن کعب قرظی ــــ جو ثقہ تابعین میں سے ہیں اور بڑے تقویٰ شعار عالم اور کثیر الحدیث ہیں ــــ نے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلعم کے عہد میں میں نے اپنے آپ کو دیکھا ہے کہ بھوک کی شدت کی وجہ سے میں اپنے پیٹ پر پتھر باندھا کرتا تھا۔ لیکن اب میرے مال کی زکوٰۃ سالانہ چالیس ہزار ہوتی ہے۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں کروڑپتیوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور وہ بھی اپنے دونوں بھائیوں یعنی حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کی طرح اپنے مالوں کی زکوٰۃ سے بیت المال کو بھر دیا کرتے تھے، اس کے علاوہ بہت سے مستور الحال گھرانوں میں ان کے صدقات اور میراث سے خوشی اور سرور کے چراغ جل جایا کرتے تھے۔ لیکن یہ مالدار صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ــ باوجودیکہ اپنے اموال کی زکوٰۃ بھی ادا کر دیتے تھے اور اپنی ملت کے بے شمار مفلوک الحال پر صدقات کرتے رہتے تھے۔ پھر بھی وہ اپنے گھروں میں ایک اوسط درجہ کی زندگی بسر کرتے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ اس اوسط درجہ کی زندگی میں جو کچھ ان کے پاس بچ جاتا ہے وہ ان کے ہاتھوں میں اللہ کی امانت ہے جسے وہ خوش حالی کے دنوں میں بدحالی کے دنوں کے لئے ذخیرہ کرتے ہیں اور جب وہ بدحالی کے دن آ جاتے تو پھر مسلمانوں کی مجموعی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ وہ انتہائی فراخ دلی۔ حوصلہ اور سخاوت سے خرچ کرتے تھے۔ وہ جب دیکھتے تھے کہ ملت کی مصلحت کو اس کثیر مدد کی ضرورت ہے تو وہ اپنے ان بابرکت مالوں کو اُمت کی صلح اور جنگ ہر حالت میں بے دریغ خرچ کر دیتے تھے۔

ان مالدار صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنے بھائی ابوذر غفاریؓ سے اس بارہ میں کوئی اختلاف نہیں تھا کہ مال کے بارہ میں اسلام کا نظام اس کو وسیلہ اور ذریعہ مانتا ہے اور اسے قطعاً زندگی کا منتہیٰ اور مقصود تسلیم نہیں کرتا۔ البتہ انھیں اس بارہ میں اختلاف تھا کہ اس وسیلہ کے معنی کی حد کیا ہونی چاہیئے۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ وسیلہ ہونے کی حیثیت سے مال کی ذخیرہ اندوزی کو منع کرتے ہیں۔ اور اسے وہ کنز شمار کرتے ہیں جس سے قیامت کے دن مالداروں کی پیشانیاں داغ دی جائیں گی۔ لیکن حضرت ابوذرؓ کے دوسرے بھائی اس وعید کو ان لوگوں پر محمول کرتے تھے جو اس ذخیرہ اندوزی اور مالداری کے واجبات و حقوق کو ادا کرنے میں کوتاہی برتتے ہیں۔ اور جو لوگ انفرادی ضرورتوں سے زیادہ مال میں امانت کے معنے کو سمجھنا نہیں چاہتے اور اس طرح اسراف اور فضول خرچی کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے زائد از ضرورت اموال کو ان مواقع میں استعمال نہیں کرتے جن میں ان کو استعمال کرنا خدا کی رضا کا سبب ہو سکتا تھا۔

اس کے بعد مال کے بارہ میں نظامِ اسلامی کے حقائق میں سے ہم دوسری حقیقت کا سامنا کرتے ہیں جو یہ ہے کہ مسلمان سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اوسط درجہ کی زندگی بسر کرے جس میں نہ اسراف ہو نہ بخل ہو۔ نیز یہ کہ خود اس پر اور اس کے ماتحتوں پر ــــ اولاد اور اقرباء پر ــــ یہ بھی واجب ہے کہ وہ ترفہ اور تنعم کی ان چیزوں کے عادی ہونے سے دور رہیں جن کے بغیر بھی وہ گذارہ کر سکتے ہیں تاکہ ــــ عادت کے مطابق ــــ یہ چیزیں اس کی ضروریات میں داخل نہ ہو جائیں۔ اس طرح وہ اپنی حرّیت اور آزادی کے عناصر میں سے ایک اہم عنصر کو کھو دیں گے۔

آزادگی اور حرّیت کا شمار کمالات میں سے ہوتا ہے۔ درحقیقت آزادگی اور حرّیت خوش نصیبی اور سعادت کے سرچشموں میں سے ایک سرچشمہ ہے۔ حرّیت اور آزادگی

[1] خود حضرت ابوذر غفاریؓ اور ان کے مسلک کے مخالفین کے متعلق طلوعِ اسلام میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ طلوعِ اسلام

[2] سوال یہ ہے کہ حضرت عیسےٰ کا یہ ارشاد ایک وقتی فیصلہ تھا یا وحی کی بنا پر انسان کی معاشی زندگی کا محکم اصول تھا؟ ظاہر ہے کہ انسانی معاشرہ کے متعلق اتنا عظیم فیصلہ وحی کی بنا پر ہی ہو سکتا ہے قرآن نے خود اس تصور کی تائید کی ہے جب دولت جمع کرنے والوں کو جہنمی بتایا ہے لہٰذا حضرت ابوذر غفاری کا مسلک قرآنی تصور کے عین مطابق تھا۔ طلوعِ اسلام

غلامی اور پابندی کے مقابلہ میں اس طرح قابل ترجیح ہیں جس طرح ایک حکیم آدمی اپنی قوم کے لئے قوت اور طاقت کو ضعف اور کمزوری پر ترجیح دیتا ہے۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ جب مسلمانوں کو تاکید فرماتے تھے کہ موٹی جھوٹی زندگی اختیار کرو۔ نعمتیں ہمیشہ نہیں رہا کرتیں ۔۔۔۔ تو ان کا اس سے یہی مقصد ہوتا تھا ۔۔۔۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ آزادہ منشی نفس کی حریت کے مراتب میں سے ایک بلند مرتبہ کا نام ہے۔ امام محمد بن ادریس شافعی میری آنکھوں میں سما جاتے ہیں کیونکہ وہ ان بلند مقاصد کو ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھتے تھے۔ ان کا ایک مرتبہ ایک ایسے شخص پر گذر ہوا جو شہر فسطاط میں دریائے نیل کے کنارہ پر بیٹھا وضو کر رہا تھا اور بے دردی اور اسراف کے ساتھ پانی بہا رہا تھا تو امام شافعیؒ نے اس اسراف سے اس کو منع کیا۔ ظاہر ہے کہ امام شافعیؒ کو یہ اندیشہ تو تھا نہیں کہ وضو کرنے والے کے اس اسراف سے دریائے نیل کے پانی میں کچھ کمی ہو جائے گی بلکہ انہیں اندیشہ یہ تھا کہ اگر یہ شخص آج وضو کرنے میں پانی کو یوں اسراف کے ساتھ بہانے کا عادی ہو گیا تو کل کو یہ شخص اپنے کھانے پینے اور پہننے میں بھی اسراف کا عادی ہو جائے گا۔ حالانکہ اسلام مسلمانوں کے متعلق اسے پسند نہیں کرتا کہ وہ اسراف کریں حق تعالیٰ نے قرآنی نص کے ساتھ مسلمانوں کو اسراف سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے

وَلَا تُسْرِفُوْا ، اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝

اور اسراف نہ کیا کرو۔ یقیناً خدا اسراف کرنیوالوں کو پسند نہیں کرتا۔

مسلمان جب اپنے نفس میں اسراف اور راحت و آرام میں انہماک سے بچنے کی مشق بہم پہونچا لیتا ہے تو وہ دراصل اس طرح اپنے نفس کو مشکلات برداشت کرنے اور مصائب پڑنے پر ان کا سامنا کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیتا ہے۔ ابتدائی مسلمان جنھوں نے دعوت اسلام کو قبول کیا تھا، تنعم و ترفہ سے آزاد رہتے تھے ۔۔۔ لقد طاقت ۔۔۔ اپنی ان سابقہ خصوصیات پر سختی سے قائم تھے جو ان کی عربیت کے قومی خصائل میں داخل تھیں۔ کیونکہ وسائل تنعم سے بے نیازی اور سادگی ان کے نزدیک آزادگی اور حریت کے بلند ترین معانی میں شمار ہوتی تھی۔ وہ اپنی فطرت سلیمہ کے مطابق اس کو یہ سمجھتے تھے کہ شہر ایک قید خانہ ہوتا ہے۔ اور مدنیت ایک قید ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ انھوں نے لفظ مَدِیْنَۃٌ (شہر) اور مَدَنِیَّۃ (شہری زندگی) دونوں لفظوں کا اشتقاق دَانَ، یَدِیْنُ کے مادہ سے کیا تھا جس کے معنے میں عاجزی، انکسار اور اطاعت اور غلامی کا مفہوم پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہ تصور، زندگی کے اس مسلک کے قطعی خلاف تھا جسے وہ خوش نصیبی اور سعادت کی زندگی شمار کرتے تھے۔ وہ لوگ صرف ایسی ہی زندگی کو سعادت کی زندگی شمار کرتے تھے۔ جو اپنے وسیع ترین دائروں میں ان کے لئے شریفانہ اور بلند مرتبہ حریت کی ضامن ہو سکتی ہو۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کے زمانہ میں حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے عالی شان محل میں ایک بادیہ نشین آزاد، عقلمند خاتون کو بلایا اور خواہش کی کہ وہ ملکۂ محل اور ان کے بیٹے اور ولی عہد کی ماں بننا منظور کرے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس عاقلہ خاتون کا حال کیا تھا؟ ۔۔۔ یہ خاتون، میسون بنت بجدل قضاعیہ تھیں ۔۔۔ وہ سبز محل میں ان اسباب تنعم و ترفہ کی بناء پر جن کے یہ تمام شہری لوگ پابند تھے اپنے سینہ میں ہمیشہ تنگی محسوس کرتی تھیں۔ یہ تمام وہ چیزیں تھیں جن سے ہر عربی مرد اور ہر عربی عورت کی طبیعت دور بھاگتی تھی۔ ان کے وہ شعر عرب ممالک میں آج تک گنگنائے جاتے ہیں جن میں وہ کہتی ہیں۔

وہ گھر جس میں ہوائیں آزادی کے ساتھ گذرتی رہتی ہوں مجھے ان اونچے اونچے محلات سے کہیں زیادہ پسند ہے۔ ڈھیلی ڈھالی عبا پہننا جس سے میری آنکھوں میں ٹھنڈک آتی ہے مجھے ان شہری تنگ اور کسے ہوئے لباسوں سے کہیں زیادہ محبوب ہے۔

زندگی کی طرف یہی وہ فطری اور سلیم نگاہ تھی ۔۔۔ اور اس کے ساتھ اور بھی بہت سی بلند مرتبہ حریت اور آزادہ منشی کی خصوصیات شریک ہوتی تھیں ۔۔۔ جس نے عربوں کو اسلامی نظام کو سمجھنے اور اسی نظام پر عمل کرنے کا اہل بنا دیا تھا۔ یہی وہ خصوصیات تھیں جن کے سہارے وہ اس قابل ہوئے کہ اسلام کا پیغام اکنافِ عالم تک پہونچا سکیں اور اس کی بنیادوں کو قائم کر کے بلند مرتبہ انسانیت کے قصر مشید کی دیواریں اٹھا سکیں۔ بلند مرتبہ انسانیت کا وہ قصر مشید جس کی بنیادیں بکھرنے اور دیواریں گرنے سے آج ہم بھی دوچار ہو رہے ہیں۔ کیونکہ تنعم و ترفہ کی پابندیوں نے ہمارے شانوں کو بھاری اور ہماری پشتوں کو بوجھل بنا دیا ہے۔ لہذا کسب حلال کے لئے اسلام نے جو شرائط عائد کی تھیں۔ ان سے ہم چھٹکارا حاصل کرتے جا رہے ہیں اور لین دین میں اسلام کی مقررہ حدود سے بہت دور نکل چکے ہیں۔ اسلام کے قافلہ میں سیادت اور سعادت کی طرف قدم بڑھانے میں ہمارے پاؤں نہایت سست اور بوجھل ہو کر رہ گئے ہیں اور ہم قطعاً اس رفتار سے نہیں چل رہے جس رفتار سے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اسلام کی انتہائی بلند منزلوں کی طرف جا رہے تھے۔

مال ایک ہتھیار ہے۔ اور جس طرح ہتھیار حاصل کرنے اور اسے ساتھ لے کر چلنے میں کچھ پابندیاں اور شرائط ہوتی ہیں۔ اسی طرح مال کو حاصل کرنے کے لئے اور حاصل کرنے کے بعد اس کو ذخیرہ کرنے کے لئے بھی کچھ قیود و شرائط ہیں جس طرح ایک آدمی ان معاملات میں ہتھیار کو استعمال نہیں کر سکتا جو صرف اس کی ذات ہی سے تعلق رکھتے ہوں بجز اس صورت کے کہ اس کی زندگی کو اگر کوئی خطرہ لاحق ہو اور اپنی زندگی کی مدافعت میں اسے استعمال کرے۔ اسی طرح نظام اسلام میں مال بھی آزادی کے ساتھ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ وہ صاحب مال کی ضرورتوں اور حاجتوں میں نہایت تنگ ترین قیود و حدود کے اندر ہی استعمال ہو سکتا ہے اسے ہر وقت اس قرآنی ہدایت کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے جو مسرفین اور مبذرین کی تصریح کرتے ہوئے خدا کی ناراضگی اور غضب سے متعلق بیان ہوئی ہے۔ پھر اس کے بعد یہ مال ہتھیاروں کی طرح جماعت اور مملکت کی قوت کا ذریعہ ہوتا ہے۔ تاکہ مملکت میں امن و اطمینان کی فضا پیدا کی جا سکے اور خطرات سے اس کی مدافعت کی جا سکے۔

ہمارے زمانہ میں یومیہ اجرت پر کام کرنے والا مزدور جو کہ تمباکو پیتا اور کثرت سے چائے نوشی کرتا ہو۔ درآنحالیکہ وہ ان دونوں چیزوں کو چھوڑ سکتا ہو۔ تو اندازہ لگائیے کہ وہ سال بھر

دو نئے بلند پایہ اسلامی تاریخی ناول

مرگ یزید　　از: خالد پرویز

چراغ مصطفوی اور شرار بولہبی ازل سے برسر پیکار ہیں۔ یزدان و اہرمن۔ ابراہیم و نمرود۔ موسیٰ و فرعون ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ حادثہ کربلا بھی مظلومیٔ حق کی ایک ایسی ہی درد انگیز مثال ہے۔ مگر ہم واقعۂ کربلا سے اتنے واقف نہیں جتنے حضرت امام حسین علیہ السلام کی مظلومیت سے آگاہ ہیں۔ ہمیں ان تاریک قوتوں کے متعلق بہت کم معلومات ہیں جو اسلام کو برباد کرنے پر تل گئی تھیں اور جن کی نمائندگی یزید کرتا تھا۔

ہم یہ نہیں جانتے کہ یزید جس کے عہد میں کربلا کا خونیں واقعہ پیش آیا۔ اور تاریخ اسلام کے صفحات پر خون شہادت کی مقدس مہر ثبت ہوئی۔ وہ کون تھا۔ خود اس یزید کی موت کیسے ہوئی۔ کربلا کے خونی حوادث سے پہلے اور مابعد کیا ہوا؟ یہ دردناک داستان بیک وقت ناول بھی ہے۔ تاریخ بھی ہے اور ایک سوانحعمری بھی۔

صفحات ۴۰۸ مجلد رنگین گرد پوش۔ قیمت پانچ روپیہ بارہ آنے

خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر　　سید ظہور احمد ندوی

وہ جواں ہمت مجاہد جس نے یورپ کے قصر شاہی میں لرزہ ڈال دیا جس کی تیغ جوہر دار کا لوہان کر اندلس کی پہنائیاں سمٹ جاتی تھیں اور جس کی ہیبت سے شاہ فرانس کا محل تھر تھرانے لگتا تھا۔ اندلس میں اسلامی حکومت کی پر شوکت اور شاندار زمانہ کی جیتی جاگتی تصویر اس کتاب میں پیش کی گئی ہے۔ صفحات ۴۱۶۔ مجلد رنگین گرد پوش۔ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے

نفیس اکیڈیمی　　بلاسس اسٹریٹ کراچی

میں اپنے خرچ میں سے کس قدر بچا سکیگا جسے وہ اپنی بیوی اور بچوں اور دوسرے رشتہ داروں کے طعام و لباس میں صرف کر سکتا ہے۔ اور کوئی بعید نہیں کہ اس طرح وہ دس سال کے عرصہ میں اتنا بچا سکے کہ اپنے بیوی بچوں کے لئے ایک صحت افزا سادہ سا مکان بنا دے جو اس کی مدت حیات کے ختم ہو جانے پر ان کے لئے بہترین اثاثہ ہو سکتا ہے۔ اس پر اتنا اور اضافہ کر لیجئے کہ ان دونوں غیر ضروری چیزوں کو چھوڑ کر وہ اپنے سینہ اور پیٹ کو بھی بیماریوں سے محفوظ رکھیگا۔ اگر ہمارے زیادہ تر مزدور اور عمال اپنی محدود کمائی میں ان تنعم و ترفہ کی پابندیوں سے آزاد رہ کر تربیت پا سکیں تو وہ اخلاقی اور معیشتی حیثیت سے کس درجہ خوش نصیب ہوں گے۔ اور اپنے حالات پر کتنا اچھا کنٹرول کر سکیں گے۔ وہ اپنے فرائض و واجبات کو سہولت اور خوش دلی سے ادا کر سکیں گے۔ ان بے جا پابندیوں سے آزاد ہو کر ان سے صرف وہ زائد چیزیں ہی چھوٹیں گی جو صحت اور اخلاق کے لئے مضر تھیں۔ وہ بری عادتیں چھوٹ جائیں گی جو انسان کی بے مائیگی اور کمینگی پر دلالت کرتی ہیں۔ نہ وہ انسان کو فراخی بخشتی ہیں اور نہ اس کی بھوک مٹا سکتی ہیں۔ ذرا اندازہ لگائیے کہ مملکت مصریہ سالانہ کس قدر خطیر رقم محض ریشمی پر تکلف موزوں پر خرچ کر ڈالتی ہے۔ جو نہ کوئی گرمی پہنچاتے ہیں اور نہ کوئی ستر ہی ڈھانپتے ہیں۔ کیا وہ مال جو ان چیزوں پر صرف کیا جاتا ہے حرام نہیں ہو جاتا؟ اور اگر ہم اپنے مال کو اسلامی ہدایات کے مطابق خرچ کریں۔ تو کیا ہم اس روپے کو ان بیہودہ موزوں پر اڑا سکتے ہیں۔؟

تنعم و ترفہ کی پابندیوں سے آزادی اور بقدر ضرورت پر اکتفا کرنا ان بلند اخلاقیات میں سے ہے۔ جس کی طرف تورات کی دنیا میں مسیح عیسیٰؑ ابن مریم نے دعوت دی تھی اور قرآن کی دنیا میں مسلمانوں کے مسیح ابوذر غفاریؓ نے دعوت دی۔ یہ اسلام بذات خود ایک معتدل اور وسطی دین ہے۔ وہ طبیعت سے مقابلہ کرنا نہیں چاہتا بلکہ اس کو درست کرنا اور اس کے رجحانات میں اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ اس نے انسانیت کو ہر چیز میں اعتدال کی طرف رہنمائی کی ہے۔ ثروت و غنا میں بھی اعتدال فقر اور زہد میں بھی اعتدال۔ محبت میں بھی اعتدال اور بغض میں بھی اعتدال۔ راحت میں بھی اعتدال اور نشاط اور سعی و جہد میں بھی اعتدال۔ بلکہ وہ تو ——— حالانکہ وہ ایک دین ہے ——— خود دین میں بھی اعتدال کی ہی طرف دعوت دیتا ہوا آیا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ لا رھبانیۃ فی الاسلام (اسلام میں رہبانیت نہیں ہے) وہ کہتا ہے کہ یہ دین نہایت محکم دین ہے۔ اس میں نرمی کے ساتھ داخل ہو۔ نیز وہ کہتا ہے کہ الدین یسر (دین سہولت ہی سہولت ہے) اس کا ارشاد ہے کہ یاد رکھو جو شخص دین پر غالب آ جانے کی کوشش کرے گا دین اسے مغلوب کر کے چھوڑے گا۔ وہ ہدایت دیتا ہے کہ دین میں غلو کرنے سے باز رہو۔ تم سے پہلے جو قومیں ہلاک ہوئی ہیں۔ وہ دین میں غلو کرنے ہی کی وجہ سے ہلاک ہوئی ہیں۔

اگر غنا اور مالداری کا اس حد تک مقابلہ کرنا جس حد تک مسیح عیسیٰ ابن مریم سے منقول ہے آسان ہوتا تو مسیحی کمیناؤں کے بعض عظماء اپنے طعام، لباس اور مسکن اور شہروں میں حضرت مسیح کے مسلک کے خلاف نہ جاتے۔ بہت سے مسیحی عقلاء نے اس وسیع خلیج کو محسوس کیا ہے جو اس نظریہ کے درمیان اور نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کے درمیان حائل ہے۔ ان میں سے ایک جبران خلیل جبران ہیں۔ جنہوں نے اس موضوع پر متعدد فصلیں اور کئی کہانیاں لکھی ہیں۔ بلکہ بعض کتابیں بھی مستقل طور پر اسی موضوع سے متعلق لکھی ہیں۔ جن کو پڑھ کر ہمارے ادب آموز لوگ مستفید ہوتے ہیں۔ جب اس تصور پر خود وہ لوگ عمل نہیں کر سکے جو مسیح کی وراثت کی مدعی ہیں۔ اور ان کے نام سے ان کے دین کی لوگوں کو دعوت دیتے ہیں تو ابوذر غفاریؓ کے معاصرین بطریق اولیٰ یہ خیال کر سکتے تھے کہ اسلامی نظام ایک معتدل نظام ہے۔ لہٰذا اس میں ہی نظریات ہو سکتے ہیں جو زندگی کے لئے زیادہ موزوں اور مناسب ہوں۔ لیکن کتنا اچھا ہوتا۔ اگر انسانوں کے لئے مسیح عیسیٰؑ ابن مریم اور ہمارے مسیح محمدی ابوذر غفاریؓ کے طریقہ پر عمل کرنا آسان ہوتا۔[1] اگر ایسا ہو جاتا تو یقیناً اس سے بہت سے شروں کے دروازے بند ہو جاتے اور اس طرح انسان میں جو قناعت پیدا ہوتی اس پر انسانوں کی رضامندی ایک ایسی سعادت بن جاتی جس کی لذت کو صرف وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو اس طریقہ سے مانوس ہوں اور اسے پسند کرتے ہوں۔ مگر بہت ہی تھوڑے لوگ ایسے ہوں گے۔ بلکہ ایسے لوگ کہاں ہوں گے؟[2]

باطل کمیونزم کے داعیوں کو یہ طمع ہرگز نہ ہونی چاہیئے کہ تاریخ اسلام میں ابوذر غفاریؓ، ان کی دعوت اور ان کے طریق عمل کی وجہ سے ان کے لئے کوئی تائید مل جاتی ہے۔ کیونکہ ان کے جابر جو کریملن کے محلات میں زندگیاں گزارتے ہیں ——— حتیٰ کہ اگر وہ ابوذرؓ کے محبوب اعظم اور معلم اکبر صلوات اللہ علیہ وسلامہ کی امت میں بھی داخل ہو جائیں ——— تب بھی ابوذرؓ کی بارگاہ سے جہنم کے ایندھن اور انسانیت کے فراعنہ اور نمارود ہی کا خطاب مل سکے گا۔[3] جو لوگ گدلے پانیوں میں شکار کھیلنے کے عادی ہیں اور ابوذر غفاریؓ اور امیر معاویہؓ کے باہمی نظریاتی اختلاف سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ان کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ امیر معاویہؓ اپنی سیرت اور معیشت میں صالح اور نیک لوگوں میں سے تھے۔ وہ اسلام کے چراغوں میں سے ایک چراغ تھے لیکن وہ خلفائے راشدین کے ان آفتابوں کے بعد آئے جن کی مثل آفتاب زمانہ روز روز پیدا نہیں کیا کرتا۔ چراغ کی روشنی کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو وہ آفتاب کے بعد میں جس نے پوری زمین کو ہدایت اور نور سے بھر دیا ہو، چراغ ہی رہے گا۔ امام احمد بن حنبل نے جو اپنے زمانہ میں زاہدوں کے امام تھے اور زہد کے معنی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ جنہوں نے خود اپنے اوپر زہد طاری کر رکھا تھا اور بڑے بڑے زاہد و مرتاض لوگوں کو دیکھ چکے تھے انہوں نے خود امیر معاویہؓ کی سیرت سے ایسی مثالیں دی ہیں جن کی پیروی ہر زاہد و مرتاض کو کرنی چاہیئے۔ جو شخص ان مثالوں اور نمونوں کو دیکھنا چاہے اسے امام احمد بن حنبلؒ کی تصنیف "کتاب الزہد" میں امیر معاویہؓ کے زہد کا بیان دیکھنا چاہیئے تاکہ وہ ان کی زندگی کو اپنے لئے راہنما اور اسوہ بنا سکے۔

اب ہمیں وضاحت سے یہ بتا دینا چاہیئے کہ نظام اسلام میں مال کا کیا مرتبہ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مال میں مسلمانوں کے تصرف کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو وہ تصرفات جن کا تعلق ایک مسلمان کی شخصی حیثیت سے ہو تو رسول اللہ صلعم اور آپ کے اصحابؓ اور تابعین اور باقی مسلمانوں کی یہ ہی سنت چلی آ رہی ہے کہ مسلمان کو استعمال پر اکتفا کرنا چاہیئے جو اس کی ضروریات کے لئے ضروری ہو اور تنعم اور ترفہ کی ان پابندیوں سے اسے آزاد رہنا چاہیئے جن کے بغیر گزارہ ہو سکتا ہو۔ عمر بن عبد العزیزؒ کو دیکھو جنہیں شام، مصر، عراق، حجاز، یمن اور دنیا کے دائیں بازو پر ایران اور سندھ تک اور بائیں بازو پر شمالی افریقہ اور ملک اسپانیا تک پر غلبہ و اقتدار حاصل تھا۔ جن کے پاس ان تمام ممالک سے عشر، خراج اور دیگر ٹیکسوں سے وصول شدہ اموال بھیجے جاتے تھے۔ مگر ان کے گھر میں ان کے دستر خوان کا صرفہ اس دستر خوان سے بھی کم ہوتا تھا جو ہمارے زمانہ میں ایک ساتویں درجہ (G, CATAGORY) کے سرکاری ملازم کے دستر خوان کا صرفہ ہوتا ہے۔ عمر بن عبد العزیزؒ ایسا کیوں کرتے تھے؟ محض اس لئے کہ وہ اپنی ذاتی معیشت میں ایک مسلمان کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ اور مال میں وہی تصرفات کرنا چاہتے تھے جن کی ایک اسلامی نظام اجازت دیتا ہے۔

دوسری حالت یہ ہو سکتی ہے کہ کسی مسلمان کے ہاتھ میں کچھ مال ہے ——— یہ حکومت کا مال ہو یا ملت کی مصالح سے متعلق مال ہو یا میراث یا کسب حلال کے ذریعہ سے اس کی ذاتی ملکیت میں آیا ہوا مال ہو۔ لیکن وہ اس کی ضروریات سے زیادہ ہو ——— تو اس قسم کا مال، خواہ وہ خدا کی امانتوں میں سے ہو یا خدا کے عطیات میں سے ہو (خدا کے عطیات میں سے جو مال ہو وہ خواہ کسی فیکٹری یا کارخانہ کی صورت میں ہو، یا تجارت کی شکل میں ہو، یا زرعی زمین، افتادہ زمین یا مکانوں کی صورت میں ہو۔ کم ہو یا زیادہ ہو) تو اسلام ان تمام اموال کی طرف اسی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ وہ اس مسلمان کے ہاتھ میں اللہ کی ایک امانت ہے۔ اس مسلمان سے اس بارہ میں کہ اس نے اس مال میں کس طرح تصرف کیا تھا بہ نسبت اس کے کئی گنا زیادہ

---

[1] اس مسلک پر انفرادی طور پر چلنا تو واقعی ناممکن ہے لیکن جب معاشرہ میں قرآنی نظام قائم ہو جائے تو پھر نہ صرف یہ کہ اس مسلک پر چلنا ناممکن نہیں ہوتا بلکہ یہی مسلک صحیح مسلک زندگی قرار پا جاتا ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کا مسلک دین میں غلو کا مسلک نہیں تھا۔ وہ عین قرآن کے مطابق تھا۔ لیکن انفرادی طور پر اس کا نفاذ مشکل تھا وہ اجتماعی حیثیت ہی سے نفاذ پذیر ہو سکتا تھا (طلوع اسلام)

[2] سوال ایسے لوگوں کے پیدا ہونے کا نہیں۔ اصل سوال ایسے نظام کے قیام کا ہے جس میں یہ مسلک صحیح مسلک زندگی قرار پا جائے (طلوع اسلام)

[3] کمیونزم کے باطل ہونے کی صرف یہی وجہ نہیں کہ اس کے اکابر کریملن کے محلات میں جابرہ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر وہ ایسی زندگی نہ بھی بسر کریں تب بھی کمیونزم ایک باطل تصور حیات ہے اس کا فلسفہ یکسر باطل کی بنیادوں پر قائم ہے۔ (طلوع اسلام)

محاسبہ کیا جائے گا کہ اس نے یہ مال کس طرح حاصل کیا تھا۔ یہ تصرف زمانہ اور زمانہ کے حالات، ملت اور ملت کی عام ضروریات کے مطابق مختلف ہو سکتا ہے۔ ہمارے اسلاف کے زمانہ میں عسکریت اور اقتصادیات کو وہ اہمیت حاصل نہیں تھی جو انہیں آج حاصل ہے۔ لہٰذا اس زمانے میں زائد از ضرورت مال کے صرف کرنے کا طریق بھی آج سے مختلف تھا۔ ہمارے اغنیاء اور مالدار لوگ زائد مال کو ان مواقع پر صرف کر دیتے تھے جنہیں ہماری تاریخ میں سخاوت اور کرم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ ان اموال کو ان لوگوں پر صرف کرتے تھے جو ان کے پاس پناہ لیتے اور اپنی امیدوں کو ان کی سخاوت سے وابستہ کر لیتے تھے ـــــ وہ اس درجہ سخاوت کرتے تھے کہ آج اس کا تعین کرنا بھی مشکل ہے۔ وہ ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے تھے جہاں وہ اپنی سخاوت کے جوہر دکھا سکیں۔ اس قسم کے بے شمار واقعات تاریخ کے صفحات پر مل سکتے ہیں۔ وہ ایسا اس لئے کرتے تھے کہ وہ خوب سمجھتے تھے کہ مال کی مقدار کا تھوڑے سے ہاتھوں میں جمع ہو جانا اس کی گردش کو روک دیتا ہے۔ تا آنکہ وہ ضرورت مندوں کے ہاتھوں تک نہ پہنچ جائے۔ وہ محض اپنے اموال کی زکوٰۃ نکال دینے ہی پر اکتفا نہیں کرتے تھے اور اس قسم کے دوسرے صدقات میں اموال کو تقسیم کرنے ہی پر بس نہیں کر دیتے تھے ـــــ اس کی مختلف صورتیں ہوتی تھیں۔ کبھی اوقاف جاریہ کی صورت میں اس طرح خرچ کر دینا کہ اصل مال ہمیشہ باقی رہے اور کبھی اس طرح پر صرف کر دینا کہ اصل مال ختم ہو جائے جیسے مختلف طریقوں سے مختلف موقعوں پر صدقہ و خیرات کر کے مال کو صرف کر دینا ـــــ اس سخاوت میں عربوں کے طریقہ پر چلتے ہوئے نیز اقتصادی اعتدال میں اسلام کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے وہ ایسی صورتیں پیدا کر دیتے تھے کہ فقراء اور غنیاء کے درمیان کی خلیج کافی تنگ ہو جاتی تھی۔

یہ موقع اور مصرف جس پر وہ لوگ عمل کرتے تھے اور وہ طریقہ جس کے مطابق وہ اس مقصد کو حاصل کرتے تھے بیشک صحیح اور ان کے زمانہ کے مناسب حال تھا۔ لیکن آج جبکہ مال وہ بنیادی قوت بن گیا ہے جس کے حسن انتظام پر ملت کی عزت و حرمت موقوف ہے اور جس کے خلاف جانے میں اس کی ذلت و رسوائی ہے تو آج کے ان حالات میں دینی ارشادات کی روشنی میں ذاتی اخراجات پر بقدر ضرورت مال پر اکتفا کرنا ہی واجب ہوگا۔ جیسا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اسے سمجھا تھا۔ لیکن اس میں سے جو مال ہماری ذاتی ضرورت سے زیادہ ہو اس کو صرف کرنے کا طریقہ وہ نہیں ہوگا جو پہلے زمانہ میں لوگ کرتے رہے ہیں۔ بلکہ وہ بدل جائے گا۔ آج ہم خدائے تعالیٰ کی طرف سے مقام آزمائش و امتحان میں کھڑے ہوئے ہوں کہ اس زائد از ضرورت مال کو ہم کس طرح بہتر طور پر صرف کر سکتے ہیں۔ یہ بھی عبادت ہے کہ ہم ان اموال کو نیکٹریاں قائم کرنے میں صرف کریں۔ اور ان اموال کو بڑھاتے جائیں اور اس طرح بکثرت رفاہ عام کی چیزیں قائم کرتے جائیں۔ بشرطیکہ اس سے نیت مسلمانوں کی حالت کو سدھارنا اور اُن کی مشکلات کو آسان کرنا اور اُن میں اجتماعی، اقتصادی، علمی، عمرانی اور جنگی اعتبارات سے مکمل مساوات پیدا کر دینا ہو۔

بے محل نہ ہوگا اگر میں یہاں مختصراً اسلام میں تعاون کی اہمیت پر بھی کچھ روشنی ڈال دوں۔ مسلمان وجوبی طور پر تعاون کیلئے مامور ہیں۔ اس کے وجوب کی اہمیت ان دوسری چیزوں کے وجوب سے کچھ بھی کم نہیں ہے جنہیں اسلام نے واجب اور لازم ٹھہرایا ہے اور جنہیں ہم آج دین اور خیر سمجھتے ہیں۔ ہر وہ جائز مصلحت جس کو قائم کرنے سے افراد معاشرہ کی مشکلات کم ہوتی ہوں، مسلمان تعاون کے طریقہ سے ان کو قائم کرنے پر مامور ہیں۔ آج کل کے زمانہ میں جبکہ مال کی قوت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور مسلمان اس کے محتاج ہیں کہ وہ اپنی صنعتی، اقتصادی، عمرانی، اجتماعی اور جنگی سہولتوں کو مکمل کر سکیں تو مسلمانوں پر قطعاً واجب ہے کہ وہ تعاون کے نظام میں کافی توسیع اختیار کریں۔ حتیٰ کہ اگر اس کا نتیجہ یہ برآمد ہو کہ مسلمان قومیں تعاونی قومیں بن جائیں، ان کی مملکتیں تعاونی مملکتیں بن جائیں تو اسلام کی ہدایات کے مطابق نظام ہائے تعاون میں معمولی تبدیلیوں کے ساتھ اعتدال پیدا کر سکتے ہیں ان کو اختیار کر لینا چاہیئے۔[1]

حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے۔ ان دونوں کے درمیان کچھ ملتے جلتے امور ہیں۔ مسلمان پر واجب ہے کہ اپنے مالی انتظامات کے تمام ارادوں میں اور اپنے تمام پُرمشقت اعمال میں حلال کو تلاش کرے اور حلال ہی کی جستجو کرے۔ حرام سے بچے اور اپنے ہاتھوں کو اور اپنے دامن کو اس سے محفوظ رکھے۔ اور جو امور ایسے ہیں کہ وہ واضح نہیں بلکہ ملتے جلتے امور ہیں ان میں اس کا موقف ایک عقلمند ناصح سا ہونا چاہیئے جو شر کی تیزی کو لطیف انداز سے موڑ کر اُس کا رُخ خیر کی طرف کر دیتا ہے اسے چاہیئے کہ وہ مال کو ہمیشہ ملت کی بھلائی میں صرف کرے اور اپنے تمام تصرفات میں رضاء الٰہی اور اُمت کی ترقی و خوش حالی کو ملحوظ رکھے اور جہاں تک ممکن ہو سکے ایسے اسباب خیر کو بکثرت پیدا کرتا چلا جائے جس میں مسلمانوں کا اجتماعی مفاد اور ساتھ ہی جُدا جُدا افراد کا مفاد بھی پنہاں ہو۔

[1] سب سے پہلے، ایک ملک کے اندر، وسائل پیداوار کا تعاونی بنا دینا نہایت ضروری ہے۔ یعنی ایسے افراد کی ذاتی اور انفرادی ملکیت سے نکال کر، ملت کی مشترکہ تحویل میں دے دینا تاکہ متعاون افراد معاشرہ کی جملہ ضروریات زندگی بطریق احسن پوری ہوتی رہیں۔ پھر اس قسم کا تعاون مختلف اسلامی ممالک کے مابین بھی ہو سکتا ہے۔

بزم طلوع اسلام

گولی مار۔ کراچی

محمد یسین صاحب ترجمان، اطلاع دیتے ہیں کہ جولائی کے مہینے میں حسب پروگرام ہر جمعہ کو نماز مغرب کے بعد اجلاس منعقد ہوئے۔ یکم، ۱۵ اور ۲۲ تاریخ کے اجلاسوں میں علی الترتیب "تدوین حدیث" "عبادت کے قرآنی مفہوم" اور "قربانی" پر بحث رہی اور قرآنی نقطۂ نگاہ سے ان مسائل کے مالۂ وماعلیہ کا جائزہ لیا گیا۔ ۸ اور ۲۹ تاریخ کے اجلاسوں میں نووارد حضرات کے استفسارات کے سلسلہ میں متفرق موضوع سامنے آئے اور اسی سلسلہ میں ان کی ہر طرح تشفی کرنے کی کوشش کی گئی۔ مقام مسرت ہے کہ قرآنی فکر کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ بھی اسے کما لگا کر رہا ہے۔ یہ سرگرمیاں انشاء اللہ جاری رہیں گی اور اس فکر کو پھیلانے کی کوشش بیش از بیش ہوتی رہے گی۔

اس مہینے کے دوران میں بزم کی طرف سے کوئی پمفلٹ شائع نہیں کیا گیا کیونکہ متعلقہ مضامین پر جو مسودے موصول ہوئے انہیں بزم نے منظور نہیں کیا۔ یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا اور بساط کے مطابق پمفلٹ شائع کئے جاتے رہیں گے۔

(پمفلٹوں میں اس کی تصریح کر دی جایا کرے یہ بزم کی طرف سے ہیں۔ ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے نہیں ہیں)

(طلوع اسلام)

جامپور ضلع ڈیرہ غازی خان

حکیم قدر بخش خاں برہانی ترجمان، اطلاع دیتے ہیں کہ ۲۹ جولائی کو مغرب کے بعد بزم اجلاس بزم کے روح رواں چودھری غلام محی الدین صاحب تحصیلدار جامپور کے مکان پر منعقد ہوا۔ اس میں علاقے کے قارئین طلوع اسلام سے رابطہ پیدا کرنے کے ذرائع پر غور کیا گیا۔ بزم کے ہر رکن پر پابندی لگائی گئی ہے کہ قرآن کا مطالعہ کرے اور اپنے مطالعہ کا ماحصل بزم میں پیش کرے تاکہ تبادلہ خیالات کی صورت پیدا ہو سکے۔ چودھری محی الدین صاحب نے "سنت رسول اللہ" کے پچاس نسخے بزم کو عنایت کئے اور اعلان کیا کہ وہ لائبریری کو اپنی تمام کتابیں عطا کر دیں گے۔

بزم کی لائبریری کا باقاعدہ اجراء کر دیا ہے اس میں ادارۂ طلوع اسلام کی مطبوعات کے علاوہ علامہ اقبال کا کلام اور بعض دیگر کتب بھی موجود ہیں۔ یہ لائبریری ہر ایک شخص کے لئے کھلی ہے۔

بزم کی خواہش ہے کہ ضلع ڈیرہ غازی خاں کے تمام قارئین سے وہ رابطہ پیدا کریں۔ لہٰذہ جملہ قارئین سے التماس ہے کہ وہ ترجمان بزم کو اپنے پتے سے اطلاع دیں اور قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔

پشاور

مرزا نصیر الدین صاحب ۲۴۶۲ کندن اسٹریٹ دبگری گیٹ، پشاور شہر، ترجمان، اطلاع دیتے ہیں کہ بزم حسب استطاعت مصروف کار ہے۔ اس کا اجلاس دو ہفتے کے بعد اتوار کو عصر کے وقت باری باری تمام ارکان کے گھر پر منعقد ہوتا ہے۔ ہر اجلاس میں پروفیسر ڈاکٹر سمیع اللہ صاحب مختلف موضوعات پر قرآنی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالتے ہیں۔

بقیہ: نقد و نظر

ہے (دہرائے) جاتی ہے۔ اس سے بچنے میں طالب علموں کی سلامتی اور قوم کی فلاح ہے

خدا کرے کہ ہمارے ان عزیز بھائیوں میں سے کسی کے دل میں یہ بات اتر جائے ورنہ جو کچھ بھی ان کے اس اخبار میں دکھائی دیتا ہے وہ تو سراسر جگر خراش اور تاسف انگیز ہے

نقد و نظر

مرزائیت کیطرح
STUDENTS' VOICE مودودیت نے

قوم کو جو سب سے بڑا نقصان پہنچایا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں میں ایک اور گروہ ایسا پیدا کر دیا ہے جس کی ذہنی اور قلبی خصوصیات نفرت اور انانیت ہیں (اور اس جماعت کے افراد کو ان خصوصیات پر فخر ہوتا ہے) نفرت باقی مسلمانوں سے۔ اور انانیت یہ کہ۔ آؤ لوگو کہ یہیں نور خدا پاؤ گے۔ درحقیقت نفرت اور انانیت نفسیاتی عمل اور ردعمل کا نام ہے اور یہ دونوں خصوصیات لازم و ملزوم ہوتی ہیں۔ جب آپ یہ سمجھنے لگ جائیں کہ دنیا بھر کی خوبیاں سمٹ کر آپ اور آپ کی پارٹی میں مرکز ہو گئی ہیں اور اس سے باہر کسی کے ہاں کوئی خوبی نہیں، تو اس کا لازمی نتیجہ نفرت ہوتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں درحقیقت اس جماعت کے امیر محترم مودودی صاحب کے اپنی ذہنیت کا پرتو ہیں۔ ان میں بیحد انانیت ہے۔ اور ہر اس شخص سے نفرت جو ان سے متفق الخیال نہ ہو۔ چنانچہ اپنی پارٹی کے متعلق جس کے وہ خود امیر ہیں، ان کا ارشاد غور سے سننے کے قابل ہے۔ انھوں نے اگلے دنوں سرگودھا میں اپنی تقریر میں فرمایا کہ:۔

"اس وقت جماعت اسلامی نے دو بڑے کام کئے ہیں۔ پہلا کام جماعت نے یہ کیا ہے۔ کہ اس نے اس ملک میں قابل اعتماد کیریکٹر رکھنے والے لوگوں کو منظم کیا ہے اور یہ وہ چیز ہے کہ جس کی اس وقت ہمارے ملک کو سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس وقت کی صورت حال یہ ہے کہ ملک کی سیاسی جماعتوں، سرکاری ملازمین، تاجر اور صنعت پیشہ طبقہ غرض ہر گروہ میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہو چکی ہے کہ جن کے کیریکٹر اور کردار پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ قومی امانت اور کوئی کام سپرد کر کے انسان مطمئن نہیں ہو سکتا۔ کوئی قول و قرار اس خطرے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا کہ قول و قرار کرنے والے صاحب اپنے قول سے پھر جائیں اس کیفیت میں ملک کی عظیم اکثریت مبتلا ہے۔"

"جماعت اسلامی کی کوشش یہی ہے۔ کہ وہ دیکھے کہ اس سیرت و کردار والی قوم میں کہاں کہاں قابل اعتماد سیرت والے لوگ موجود ہیں آج بھی ہماری کوشش یہی ہے کہ ایسے مضبوط کیریکٹر والے لوگوں کو منظم کیا جائے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ کچھ قابل اعتماد لوگ بھی اس ملک میں موجود ہیں۔" ۱

"آپ اپنے شہر ہی میں جماعت اسلامی کے کارکنوں کو دیکھ لیجئے آپ دیکھیں گے کہ وہ کس محنت اور دیانت داری سے کام کرتے ہیں آپ انکے کام میں بددیانتی کا شائبہ تک نہیں پائینگے۔" ۲

(بحوالہ الاعتصام ۱۵ جولائی ۱۹۵۵ء)

اب غور کیجئے کہ جس پارٹی کے دل میں اس قسم کی انانیت کو پیوست کر دیا جائے اس کے جذبات نفرت کا کیا ٹھکانہ ہوگا!

اس قسم کے جذبات یوں تو قوم کے ہر طبقہ میں تخریب انگیز ہوتے ہیں لیکن جس قوم کے نوجوان طالب علموں کے دل کو اس طرح زہر آلود کر دیا جائے اس قوم میں ہر طرف تخریب ہی تخریب پھیل جائے گی۔ قوموں کے مستقبل کا انحصار ان کے نوجوان تعلیم یافتہ پر ہوتا ہے جس قسم کے قالب میں یہ طبقہ ڈھل جائے اسی قسم کا اس قوم کا مستقبل ہو جاتا ہے۔ جماعت اسلامی نے سب سے زیادہ اسی طبقہ کو اپنے چنگل میں گرفتار کیا ہے اور یہ طبقہ آسانی سے انکی گرفت میں آ بھی سکتا تھا اس لئے کہ جوانی کے زمانے میں جذبات کی شدت ہوتی ہے اور اس جماعت کی اپیل ہے ہی جذبات سے۔ نتیجہ یہ کہ آپ موجودہ طالب علموں کے طبقہ کو دیکھئے وہ کچھ اس رنگ میں ڈوبے ہوئے نظر آئیں گے جو رنگ ان پر اس جماعت نے چڑھا دیا ہے۔ خود پسندی نفرت، تخریبی تنقید، سرکشی۔ اور طرفہ یہ کہ ان چیزوں کو "اقامت دین" کے لئے جہاد تصور کرنے کی خود فریبی۔ یہ ہیں ہماری بدبختی سے ہماری اس آنے والی نسل کی خصوصیات! یہ خصوصیات، اس اخبار کے ایک ایک صفحہ میں جھلک رہی ہیں جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ یہ پندرہ روزہ پرچہ کراچی کی اسلامی جمعیت طلباء کا نقیب ہے جو منظور احمد صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا ہے (اسکا سالانہ چندہ اڑھائی روپیہ ہے اور قیمت فی پرچہ چار آنے)

جی چاہتا تھا کہ ہم اپنے ان عزیزان ملت سے (جن کے لئے ہمارے دل میں بڑی محبت ہے اس لئے کہ یہی ہماری مستقبل کی قوم ہیں) کچھ باتیں مشورۃً کہتے لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کے دل میں نفرت کا زہر اس درجہ بھر دیا گیا ہے کہ یہ جماعت اسلامی کے علاوہ کسی دوسرے کی بات پر کان دھرنے کو تیار ہی نہیں ہوتے انھیں یہ سکھا دیا گیا ہے کہ حق صرف اس جماعت کے اندر محصور ہے! اور جو اس دائرے کے باہر ہے وہ حق کا دشمن ہے۔ یہی چیز مرزائیوں کو سکھائی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ نے کوئی مرزائی ایسا نہ دیکھا ہوگا جو دلیل و برہان سے قائل ہو جائے۔ جو مرزائی مرزائیت سے تائب ہوتے ہیں وہ بالعموم وہی ہوتے ہیں جو اندرون خانہ جھانک کر پیچھے ہٹتے ہیں کم و بیش یہی حالت جماعت اسلامی والوں کی ہوتی جا رہی ہے۔ بہرحال اثر ہو یا نہ ہو ہم اپنے ان عزیز بھائیوں سے اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایک طالب علم کی زندگی یہ ہے کہ وہ ہر بات کی علم و بصیرت کی بنا پر تحقیق کرے۔ ہر مسئلہ پر پورا پورا غور و فکر کرے اور جس بات کو تسلیم کرے خالص دلیل و برہان کی بنا پر تسلیم کرے اور جسے رد کرے دلیل و برہان کی رو سے رد کرے۔ یہی قرآن کی تعلیم ہے اور اسی کو ایک طالب علم کا شعار بننا چاہیئے۔ جو دعوت یا تحریک نوجوانوں کے جذبات سے کھیلتی ہے وہ انھیں علم اور فکر کی راہ سے (کہ جو خاصہ انسا[نیت ہے])

۱؎ آپ نے دیکھا کہ مودودی صاحب خود اپنی زبان سے اپنے لئے کتنا بڑا اسارٹیفکیٹ تجویز فرما رہے ہیں اس لئے کہ جس جماعت کے عام افراد کے کیریکٹر کا یہ عالم ہو، ظاہر ہے کہ اس کا امیر اس اعتبار سے بلند ترین مقام پر فائز ہوگا۔ ۲؎ خالی محنت اور دیانت

ماہنامہ طلوعِ اسلام کے پرانے پرچے

ماہنامہ طلوعِ اسلام کے جو پرانے پرچے دفتر میں موجود ہیں اُن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

۱۹۴۹ء	اگست۔ ستمبر۔ نومبر۔ دسمبر
۱۹۵۰ء	نومبر
۱۹۵۱ء	مارچ تا نومبر
۱۹۵۲ء	اگست تا نومبر
۱۹۵۳ء	جنوری کے علاوہ سب
۱۹۵۴ء	پورے سال کے

یہ پرچے بزمہائے طلوعِ اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دیدیئے جائیں گے۔

خواہشمند حضرات اپنی فرمائشیں جلد بھیجیں۔ ورنہ ختم ہوجانے کا احتمال ہے۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ کراچی

مطبوعات طلوعِ اسلام کی

شرائط ایجنسی

شرح کمیشن

معراجِ انسانیت ـــــ ۲۵ فی صدی

دیگر مطبوعات ـــــ ۳۳ فی صدی

۱۔ قیمت بعد وضع کمیشن بذریعہ وی پی وصول کی جائے گی۔

۲۔ غیر فروخت شدہ کتب واپس نہیں لی جائیں گی۔

۳۔ پہلی فرمائش پچاس روپے (بعد وضع کمیشن) سے کم نہیں ہونی چاہیئے۔

۴۔ ہر آرڈر کے ہمراہ کم سے کم چوتھائی رقم پیشگی آنی چاہیئے ورنہ تعمیل نہیں ہوسکے گی۔

نوٹ:۔ کراچی کے ایجنٹ صاحبان دفتر طلوعِ اسلام سے معاملے کریں۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۔ کراچی

طلوعِ اسلام کثیر تعداد میں شائع ہوکر پاکستان ہندوستان کے علاوہ غیر ممالک میں ہر طبقہ کے لوگوں کے پاس جاتا ہے۔ اس میں چھپنے والے اشتہارات ہزاروں خریداروں کی نظروں سے گزرتے ہیں۔

نرخنامہ اشتہارات و تفصیلات ناظم ادارہ شعبۂ اشتہارات سے حاصل کیجئے

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام

پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ ـــــ کراچی

قرآنی انقلاب کا لٹریچر

معراجِ انسانیت (از پرویز) سیرتِ صاحبِ قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہبِ عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد مع گرد پوش۔ قیمت تیس روپے

ابلیس و آدم (از پرویز) سلسلۂ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظرِ ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق۔ قصۂ آدم، جنات، ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۰ صفحات ـــــ قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستورِ پاکستان اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت، علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستور پر تنقید کی گئی ہے۔ دو سو چوبیس صفحات ـــــ قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں؟ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۸۰ صفحات۔ قیمت دو روپے

سلیم کے نام (از پرویز) نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا شگفتہ مدلل اور اچھوتا جواب بڑے سائز کے ۴۰۰ صفحات ـــــ قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے روزمرہ کی زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث ۴۰۰ صفحات ـــــ قیمت چار روپے

اسبابِ زوالِ امت (از پرویز) مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا؟ ایک سو اڑتالیس صفحات ـــــ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے ایسے عنوانات ہیں جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دورِ آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ ۲۷۰ صفحات ـــــ قیمت دو روپے آٹھ آنے

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ:۔ **ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۔ کراچی**

کیا آپ نے یہ کتابیں دیکھی ہیں؟

مزاج شناسِ رسولؐ یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناسِ رسولؐ؛ مزاج شناس کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۴۰ صفحات ـــــ قیمت چار روپے

مقامِ حدیث حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات۔ اور قیمت فی جلد ـــــ چار روپے

فردوسِ گم گشتہ (از پرویز) اُن مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے۔ اُردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۳۰۴ صفحات ـــــ قیمت چھ روپے

نوادرات (از علامہ اسلم جیراجپوری) علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات ـــــ قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت (از پرویز) مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں صفحات ۱۹۲۔ قیمت دو روپے

نظامِ ربوبیت (از پرویز) انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب ضخامت تین سو صفحے ـــــ

قیمت (قسم اوّل) ـــــ چھ روپے

(قسم دوم) غیر مجلد ـــــ چار روپے

اقبال اور قرآن (از پرویز) علامہ اقبالؒ کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ ـــــ

ڈسٹ کور کے ساتھ۔ صفحات دو سو چھپن (۲۵۶) ـــــ قیمت دو روپے

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ:۔ **ادارۂ طلوعِ اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۔ کراچی**

مشرق وسطیٰ کا دفاع

(صفحہ ۸ سے آگے)

تک نہیں بہت سکے گا۔

ہمارے ہاں بدقسمتی یہ ہے کہ ایک تو مسلمان قوم عمومی طور پر جذباتی واقع ہوئی ہے۔ دوسرے ایسے اسباب پیدا کر دیئے گئے ہیں۔ جن سے ان کے جذبات اور بھی مشتعل ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہم ایسے معاملات کو خالی الذہن ہو کر کبھی نہیں سوچتے۔ روس نے ایک مدت سے ایسا پروپیگنڈا کر رکھا ہے کہ جونہی کسی نے اقوام مغرب کے کسی عمل کو بھی سراہا یا ان کی طرف دست تعاون بڑھایا۔ اسے سرمایہ داری کا حامی اور مؤید قرار دے دیا گیا۔ دوسری طرف اندرون ملک اسلامی جماعت نے ذہنوں میں یہ تصور پیدا کر دیا ہے کہ حکومت پاکستان جو فیصلہ بھی کرے۔ وہ اسلام کے خلاف، انسانیت کے خلاف مسلمانوں کے خلاف غرضیکہ ہر صحیح قدر کے خلاف ہوتا ہے چنانچہ ہم فضا میں پھیلے ہوئے ان جراثیم سے متاثر ہو کر حکومت پاکستان کے اس فیصلہ پر محاکمہ کرتے ہیں کہ اس نے امریکہ کی امداد کیوں قبول کی ہے۔ لیکن ہم صاحب فکر حضرات سے درخواست کریں گے کہ وہ سمجھ سکے کہ امریکہ کی امداد کی موافقت کرنے والوں کو ٹوڈی بچہ کہہ کر مطمئن ہو جائیں کہ ہم نے اپنا کیس بالکل ثابت کر دیا ہے۔ وہ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر فکری طور پہ غور کریں۔ اگر کوئی صاحب دلائل و براہین سے یہ ثابت کریں کہ پاکستان کو امریکہ کی بجائے روس کی طرف جھکنا چاہیئے تو طلوع اسلام ان کی تصریحات کو بخوشی اپنے ہاں شائع کرنے کو تیار ہے۔ لیکن بلا دلیل و برہان یہ فیصلہ کر دینا کہ امریکہ کی مدد قبول کرنا بدترین فیصلہ اور اس فیصلہ کی تائید کرنا انتہائی ٹوڈیت ہے۔ کسی طرح بھی صحیح روش قرار نہیں پا سکتی۔

ابلیس و آدم

سب سے پہلا انسان کس طرح معرض وجود میں آیا؟ آدم اور خلافت آدم کا مفہوم کیا ہے؟ ابلیس کیا ہے اور آویزش ابلیس و آدم کیا چیز ہے اور وحی نے انسان کو کیا عطا کیا؟ ان سوالات کے قرآنی جوابات اس کتاب میں دیکھئے۔

صفحات ۳۷۶ قیمت آٹھ روپے

اقبال اور قرآن

اقبال نے قرآنی انقلاب کی آواز سے فضا کو معمور کیا۔

قرآن کیا کہتا ہے اور اقبال کا پیغام کیا ہے؟

ان کے جوابات مفسر قرآن اور ترجمان اقبال پرویز سے سنئے۔

ضخامت ۲۲۴ صفحات قیمت دو روپے

تاریخ الامت

علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ کی تاریخ کی وہ بے مثل کتاب جو تقسیم سے پہلے بیشتر درسگاہوں میں بطور نصاب شامل تھی۔ اب مولف کی اجازت سے طلوع اسلام نے اسے دوبارہ چھاپا ہے۔

قیمت حصہ اول (سیرت رسول اللہ صلعم) دو روپے۔

قیمت حصہ دوم (خلافت راشدہ) دو روپے آٹھ آنے۔

کتاب آٹھ حصوں پر مشتمل ہے۔ باقی حصے عنقریب شائع ہو جائینگے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲۰۔ کراچی۔۳

روٹی کا مسئلہ

انسان کیلئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسکی اہمیت ہمیشہ سے رہی ہے اور ہمیشہ تک رہیگی۔

آج تک انسان نے اس مسئلہ کو کیسے حل کیا؟ اس کا جواب تلاش کیا جائے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائیگی کہ اس نے بدن کو زندہ رکھنے کے لئے اپنی جان کو رہن رکھ دیا۔

اب سوال یہ ہے

کہ کیا تدبیر اختیار کی جائے کہ انسان کا بدن اور اسکی جان دونوں سلامت رہیں؟ اس کے لئے ہمیں قرآن سے رجوع کرنا ہوگا۔

قرآن کا حل

☆ نظام ربوبیت ☆

(از - پرویز)

میں ملیگا جو بلا شبہ دور حاضرہ کی عظیم کتاب ہے۔

قسم اول - کاغذ سفید کرنا فلی - جلد مضبوط مع گرد پوش چھ روپے -

قسم دوم - کاغذ میکانیکل - صرف ڈسٹ کور کے ساتھ چار روپے -

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۲۱۳ - کراچی-۳

Title Printed at Musid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi. Text at Jawed Press, McLeod Road, Karachi. Published by Khurshid Alam from Tolu-e-Islam Office, 25/1 Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi. Editor: KHURSHID ALAM